افکار



MONTHLY

AFKAR

BHOPAL

ماہنامہ

بھوپال

افکار

جون سنہ ۱۹۴۷ء

ادارہ

رشدی - صہبا

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمو
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

جلد ۵ [illegible] شمارہ ۴۵

بمبئی آفس
۲۶۴ بلاسس روڈ بمبئی ۸

حیدرآباد آفس
۳۰۰ رسالہ عبداللہ مقیم حیدرآباد دکن

ناگپور آفس
موہن منزل چھاؤنی ناگپور

دہلی آفس
فیاض گنج بہادر گڑھ روڈ دہلی

سالانہ صہ
ششماہی ہے
فی پرچہ ۸ر

اِشاریہ

محبانِ اُردو کے لیے یہ خبر باعثِ مسرت ہوگی کہ نظام حیدرآباد نے ایک فرمان کے ذریعہ انجمن ترقیٔ اردو کی بہ ہزار کی گرانٹ پھر جاری کردی ہے، اور اس کی مسدودی کا حکم واپس لے لیا ہے، ہم نے اپنے ان ہی کالموں میں قبل ازیں اس کی صراحت کی تھی کہ حکومتِ حیدرآباد ضرور دانشمندی سے کام لے کر یہ گرانٹ جاری کردے گی، ہمیں خوشی ہے کہ پریس کی متفقہ آواز پر نظام حیدرآباد نے غور فرما کر الیا قابلِ ستائش فیصلہ کیا،

انجمن ترقیٔ اردو مولانا عبدالحق کی رہنمائی میں عرصۂ دراز سے اردو ثقافت اور لسانی ترقی کیلئے جدوجہد کر رہی ہے اور اب ساری دنیا نے اس دعوے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ موجودہ دور میں زبان کا مسئلہ ایک بار پھر نمایاں ہوگیا ہے، ایسی صورت میں اردو ورکرز کو صرف شاہی امدادوں پر ہی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنی تنظیم اور قوت کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے' —— اُردو ہماری قومی زبان ہے —— اور ہمیں دوسروں کی اعانت سے بے نیاز ہو کر اپنا تعمیری کام انجام دیتے رہنا چاہیے، اس موقع پر ہم انجمن ترقیٔ اردو کے کارکنان سے اپیل کریں گے کہ وہ اس ادارہ کی وسیع بنیادوں پر تنظیم کریں، اور اس کے دائرہ عمل کو محدود بنانے کے بجائے عوامی حیثیت دینے کی کوشش کریں، گرانٹ کے جاری ہو جانے سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہیے، بلکہ اپنی کوششوں اور سرگرمیوں میں اور زیادہ شدت پیدا کر دینا چاہیے۔

جنوبی ہند سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہاں اردو کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا ہے، صوبہ مدراس میں اُردو کے طلباء کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مقامی ہائی اسکولوں میں سند یافتہ اُردو منشیوں کی کمی کی وجہ سے اردو کی تعلیم میں رُکاوٹ پیش آ رہی ہے، بیشتر اسکولی لائبریریوں میں اردو کی کتابیں فراہم نہیں کی جاتیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلباء اردو کے امتحانات میں ناکام رہنے کی وجہ سے آگے نہیں بڑھنے پاتے، مدراس کے مسلم اراکینِ اسمبلی کو جلد از جلد ان شکایات کے ازالہ کی کوشش کرنا چاہیے، تاکہ ملک کی مشترکہ زبان کو جنوبی ہند میں کسی طرح نقصان نہ پہونچے حکومتِ مدراس کو اس سلسلہ میں فوری توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے —— اس بار تین چوٹی کے افسانے اور ایک ڈرامہ شریکِ اشاعت ہے، ناہید عالم، مرزا ادیب، عزیز اثری اور ابراہیم بی اے، کی تازہ ترین فنکارانہ تخلیقیں آپ یقیناً پسند فرمائیں گے،

فلسفۂ عمر خیام باوجود پرانا موضوع ہونے کے کافی کشش انگیز ہے صفدر اسرائیلی نے اس مضمون کو گہرے مطالعہ کے بعد پیش کیا ہے —— اور آبگینے —— شروع سے آخر تک رنگ و بو کے حسین امتزاج کے حامل ہیں، اجنبی گردشِ عیاشی ایک قمر، اے نازنین، دل میں، یسنار اور آخری ملاقات اس شمارہ کی بہترین تخلیقات ہیں۔

—: ادارہ :—

مدوجزر

سیاسی انقلاب! وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن لندن میں برطانوی کابینہ کے وزراء سے مشاورت کرنے کے بعد غیر معمولی اختیارات کے ساتھ ہندوستان واپس آ گئے ہیں، اور ۲ جون سے دہلی میں ہندوستانی لیڈروں سے انتقال اختیارات کے بارے میں مذاکرات شروع کر دیئے ہیں۔ دہلی میں جو کانفرنس ہو رہی ہے، ابھی اس کی پوری تفصیلات معلوم نہیں ہو سکی ہیں، لیکن اتنا پتہ چلا ہے کہ دہلی کی گفتگو تین مسائل طے کریگی، اور اسی میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کیا جائیگا، ——

یہ ہندوستان کے لیڈروں کے تدبر کا زبردست امتحان ہے اور اسی پر ہندوستان کے مستقبل کی بنیادیں قائم کی جائیں گی۔ یقین کیا جا رہا ہے کہ دہلی کانفرنس میں انتقال اختیارات کے بارے میں جو طریقہ کار طے پائیگا، اسی کے مطابق سیاسی تبدیلیاں عمل میں آئیں گی، اس وقت تین اہم نکات سامنے آ رہے ہیں۔

۱۔ آیا ہندوستان ایک رہنا چاہتا ہے، یا اس کی دوری تقسیم کا مطالبہ کیا جاتا ہے، یہ تقسیم ہندستان اور پاکستان کی شکل میں ہوگی

۲۔ اگر تقسیم ہند عمل میں آتی ہے تو اس کے منتخبہ نمائندوں کو تفویض اختیارات کے طریقۂ کار کے متعلق سمجھوتہ ہونا ضروری ہے

۳۔ ہندوستان کے باشندوں سے جلد از جلد یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کس نوع کی تقسیم کے متمنی ہیں تاکہ جون ۱۹۴۸ء سے قبل فوج وغیرہ کی تقسیم کا مسئلہ حل کیا جا سکے۔

برطانوی حکومت نے اگرچہ وائسرائے کو زبردست اختیارات عطا کر دیئے ہیں پھر بھی یہ ذمہ داری ہندوستان کے لیڈروں پر رکھی ہے کہ آیا وہ متحدہ ہندوستان چاہتے ہیں یا منقسم؟ آجکل ہندوستان میں انتشار کی حالت ہے، کانگریس نے اب پھر یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ وہ ۱۶ مئی والی کیبنٹ مشن کی اسکیم کو ماننے پر رضامند ہے۔ ادھر لیگ اپنے مطالبہ پاکستان پر مضبوطی سے قائم ہے، اور جب سے قائد اعظم نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں باہمی رابطہ قائم کرنے کیلئے ایک رہگذر کا مطالبہ کیا ہے، کانگریسی حلقوں میں بہت زیادہ پریشانی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم اب ناگزیر معلوم ہوتی ہے متحدہ ہندوستان کا خواب ملک کے موجودہ فرقہ وارانہ انتشار نے بالکل ختم کر دیا ہے، برطانوی انخلاء کی تاریخ مقرر ہو جانے کے باوجود سیاسی جماعتیں اپنے مطالبات سے ذرا بھی نہیں ہٹی ہیں۔ بہرکیف قیام امن کی ذمہ داری موجودہ حالت میں برطانیہ پر ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت فرقہ وارانہ "تنازعات" کے خاتمہ کے لئے اب کوئی نئی اسکیم پیش نہیں کر سکتی، اگر دہلی کانفرنس ناکام ہو گئی تو اس کا سارے ملک پر اثر پڑے گا۔ اس لئے اہل ملک کو ایسا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہئے، جو ہماری تحریک آزادی میں روڑے بن کر اٹک جائے، ہمیں کامل صبر و تحمل کے ساتھ آئندہ فیصلہ کن دور کا انتظار کرنا چاہیئے —— دنیا کے امن کا بہت کچھ انحصار اس وقت ہندوستان پر ہے اس لئے ہمیں تشدد اور اشتعال سے احتراز کرنا چاہیئے، —— امن و سکون کی ہی حالت میں اہم اور تاریخی فیصلے کئے جا سکتے ہیں —— انقلاب ہی سے ہمارے ملک کی حالت بدلیگی —— اور ہمیں اب ان سیاسی تغیرات کا انتظار کرنا چاہیئے —!

(ادارہ)

یہ فنکار ——!

ناہید عالم

صبک

جتنی ذہین اتنی ہی شوخ، جتنی شوخ اتنی ہی سنجیدہ —— کبھی بے نیازی میں نیاز کبھی نیاز میں بے نیازی، کبھی بقراری میں سکون، کبھی سکون میں بیقراری۔ بے پرواہی سے چاہ تو کبھی زندگی کے ہر لمحہ سے پیار، ہلچل، اضطراب اور لاابالی پن افتادِ طبع کے چند رنگ، تو کبھی سادگی، ٹھہراؤ اور قوت مشاہدہ کے گہرے نقوش — غرض متضاد رنگِ طبع کے ہوتے ہوئے بھی ناہید عالم برابر ارتقا کی منزلیں طے کر رہی ہے، اس فنکارہ کے کشکول میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اتنا کچھ ہے کہ سینکڑوں تہی مایہ اپنا دامن بھر سکتے ہیں۔

اس کی متلون المزاجی جس میں فطری عناصر کی بہتات اور غیر فطری عناصر کی برائے نام موجودگی ہے، اس کے فن کے عروج اور قوت مشاہدہ کی گہرائی کے بنیادی اسباب ہیں۔

کوئی نہیں جانتا کہ اس کا فن اور اس کی فنی حیثیت کل کی بات ہے لیکن کل اور آج کے تفاوت میں جو بُعد ہے اسے ادبی شعور رکھنے والے خوب جانتے ہیں، ہر لمحہ زندگی کی قدریں بدل رہی ہیں —— وقت کی گردشوں کے ساتھ ساتھ ماضی کی روایات حال سے اور حال کی بحرانی کیفیتیں مستقبل سے دست و گریباں ہیں۔ چنانچہ ہمارا افسانوی ادب بھی زندگی کی متبدل حالتوں میں مسلسل تغیر پذیر رہا —— کتنے فن کار اُبھرے اور ڈوب گئے کتنے اُبھرنے سے پہلے ہی ڈوب گئے —— کتنے اُبھرے لیکن نہ اُبھرنے کے برابر کہتے ہیں زمانہ نباض ہے، لیکن جب جب زمانہ کی نقدی شعور کھو بیٹھے تو پھر فن اور فنکار کی موت یقینی ہے ——!

ناہید اُن خوش نصیب فنکاروں میں سے ہے جو سلامت روی کے ساتھ اُبھر رہے ہیں —— کبھی نہ ڈوبنے کے لیئے، وہ ایک حساس دل، بلند نظر، پُرخلوص محبت اور نسوانی وقار کا مکمل آئینہ ہے —— اور اس کے قلم میں، اور گیتی کے سینہ پر تڑپتی ہوئی زندہ لاشوں کے خون کی بوندیں ہیں —— وہ جب لکھتی ہے تو کائنات کا ہر مٹا ہوا نقش اپنی اصلی صورت میں اس کے سامنے اُبھر آتا ہے، اس نے زندگی اور خصوصاً غلام آباد کی بے بس عورت کی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے —— چنانچہ اس کے ہر لفظ میں تڑپ اور ہر جملہ میں چبھن محسوس ہوتی ہے ——!

یہ "فنکارہ" پوری توجہ اور گہرے انہماک کے ساتھ اپنی فنی قدروں کو اجاگر کرتے ہوئے افسانوی ادب کی نئی راہیں متعین کرنے کیلئے بیتابانہ آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے —— کون جانے آج کے بعد آنے والے کل تک وہ ارتقاء کی کس منزل میں پہونچ جائے ——!

بی اے تک تعلیم —— ایک بھائی افسانہ نگار۔ دوسرا بھائی افسانہ نگار —— چھوٹی بہن افسانہ نویس خود افسانہ نویس ریاست ٹونک اور ریاست بھوپال کے شاہی رابطہ کا نتیجہ عوامی ارتباط —— ناہید کے والد ٹونک کے دیوان —— ٹونک کے نواب بھوپال کی شہزادی کے "مجازی خدا" —— جب مادی اور روحانی رابطے گہرائی کے ساتھ شدت اختیار کرلیں تو زمان و مکان کی قیدیں ختم ہو جاتی ہیں۔

سنگ و خشت

دیرشس

ایک حیدرآبادی رسالے کے اداریہ کی سرخیاں :-

۱ - انجمن ترقی اردو کے مہمل اور لغوترین کارنامے

۲ - انجمن کتابوں کے بجائے کاغذ کے پلندے پیش کر رہی ہے۔

۳ - انجمن ادب سکھانے کے بجائے سراسر بے ادبی (ست بدبد یہی ہندوستانی ادب ہے !!) کی مرتکب ہو رہی ہے !

۴ - انجمن ترقی اردو حکومت حیدرآباد کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے (شکر ہے آپ کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے!)

۵ - حکومت حیدرآباد کا فرض ہے کہ وہ انجمن کی غیر غلط "کتابوں (یہ ترکیب لائق داد ہے) کو نصاب سے فوراً خارج کر دے !

۶ - انجمن کی مہمل اور غلط سلط کتابوں کے باعث حیدرآباد کے ہونہار طالب علموں کی مٹی پلید ہو رہی ہے ......،

آخری جملہ ہے :-

ان حالات اور حقیقتوں کی روشنی میں حکومت حیدرآباد سے "بلکل" بجا طور پر ہمارا یہ پُرزور مطالبہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کی پوری امداد فوراً بند کر دی جائے ——

اور حال ہی میں اخبارات میں یہ خبر آگئی کہ نظام حیدرآباد نے ایک فرمان کے ذریعہ انجمن ترقی اردو کی گرانٹ دوبارہ جاری کر دی ہے —— ابھی تک اس خبر کا انتظار ہے کہ "مدیر شہیر" کی حرکت قلب "بند ہونے میں کتنی کسر رہ گئی ہے اور یہ کہ ڈاکٹر نے "فرق مبارک" پر کب تک برف رکھنے کی ہدایت کی ہے !!

پچھلے دنوں جب نظام بمبئی کا "رنگین مزاج" اپنے "بھوپال تال" کی سیر کو آیا تو اس نے یہاں کے بنگلا بھگتوں کو بالکل ہی ننگے لباس میں دیکھ کر بڑی حیرانی ظاہر کی ! —— بہرکیف رنگین مزاج "کو اس عبوری دور" پر متردد نہیں ہونا چاہئے ——

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — !

بیان کیا جاتا ہے کہ آگرہ میونسپل بورڈ کے زیر غور یہ اسکیم ہے کہ آگرہ کے تمام نائیوں کو اپنے پیشہ کا باقاعدہ لائسنس لینا چاہئے —— بغیر لائسنس کے کوئی حجام کسی کی حجامت بنانے کا مجاز نہیں ہوگا، خلاف ورزی کی سزا پچاس روپے جرمانہ ہوگی —— سنا ہے کہ اس اسکیم کے خلاف بطور احتجاج نائیوں نے مکمل ہڑتال کر ڈالی —— اگر نائیوں نے کہیں مسلسل ہڑتال کی تو پھر "دست خود دہان خود" کا معاملہ ہو جائیگا —— نائی کی منڈی —— آگرہ کا ایک خاص محلہ ہے، —— چنانچہ انہیں یہاں اس بال سے بھی زیادہ باریک مسئلہ پر غور کرنے کیلئے "آل انڈیا حجام کانفرنس" بلانا چاہئے —— صدارت کے لیے لدھیانہ کا "شاطو" بہت موزوں رہیگا — !

بمبئی پولیس نے ایک فلم پروڈیوسر کو اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ کیونکہ یہ اقدام "یک زوجی قانون" کے خلاف تھا —— بعد میں دو لباسیان "کو رہا کر دیا گیا۔ پروڈیوسر عقلمند ہوتا تو کہدیتا کہ یہ تو صرف "فلمی شادی" ہے —— جو کرایہ کی بیوی" نامی فلم کیلئے رچائی گئی ہے —— !

" حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے "

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے

اجنبی

(ناٹس کا ایک ورق)

تو ہے کچی کونپل اب تک جس کے لوتج میں پیار ہی پیار،
اور میں گرمی سردی، پچھلے ڈالی پر اک تنہا پات،
تو سچا موتی میں ہیرا، بکھرا جو برسوں ہاتھوں ہاتھ،
تو دوشا کی پہلی کرن ہے اور میں جیسے بھیگی رات،
تو تاروں کے نور کی دھارا، میں گہرا نیلا آکاش،
میں ہوں جیسے ٹوٹتا انشر. تو ہے جیسے شاخِ نبات،
تو ہے اک ایسی شہنائی جس کی دھن میں ناچے موت،
تیری دُنیا جیت ہی جیت ہے، میری دُنیا، چھوڑ یہ بات،

تو ہے ایک پہیلی جسکو جو بوجھے وہ جان سے جائے،
تو ہے ایسی مٹی جس سے لاکھوں پھول چڑھیں پروان،
آ میں تیرا رنگ بھی چھولوں، چھوڑ یہ بھید اور بھاؤ کی بات،
میں نے وہ سرحد چھولی ہے، جہاں امر ہو جائیں پران،
اے آنکھوں میں چھپنے والی جانے کون کہاں رہ جائے؟
جیون کی اس دوڑ میں پگلی، ہم دونوں ہیں آج انجان،
لیکن اے سپنوں کی دُنیا تو چاہے تو روگ مٹیں؛
میں نے دُنیا دیکھی ہے تو تیری باتیں جھوٹ نہ جان،
جیون کی اس دوڑ میں پگلی یاد اگر کچھ رہیتا ہے،
دو آنسو، اک دبی ہنسی، دو روحوں کی پہلی پہچان،

اختر الایمان

عیاشی

(۱)

شبستانِ جوانی کی ہوائے مخمور
ناز سے کہنہ دریچوں کے قریب آئی ہے
سرد افسانوں کی مرجھائی ہوئی کلیوں سے
ساری دنیا کی ہنسی جیسے پڑی پائی ہے
در و دیوار کی اکتائی ہوئی خاموشی
ساز جہت کو گردِ دل سے اٹھا لائی ہے
رقص بن بن کے پراسرار شبستانوں میں
نقرئی لہریں ابھرتی ہی چلی جاتی ہیں
اونگھتی راہیں سنورتی ہی چلی جاتی ہیں
اور اب کہنہ دریچوں پہ بہ اندازِ جمیل
ریشمی پردے مچلنے لگے لہرانے لگے
نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے رعنا پیکر
گنگناتے ہوئے نکلے تو فضا جھوم اٹھی
دل دھڑکنے لگے بے چین ارمانوں میں
آن کی آن میں لوگوں نے سجائے بستر
ہر نظر آئینۂ شوق کی تنہائی میں
اپنی محبوبہ کی انگڑائی کو پہچان گئی
اور اب زلفیں بکھرتی ہی چلی جاتی ہیں
اور اب زلفیں بکھرتی ہی چلی جاتی ہیں

(۲)

ابھی کچھ دیر میں پیمانے بھی آ جائیں گے
آ کے رنگین خیالات سے ٹکرائیں گے
ایک لمحے کے لیے چونک پڑیں گی موجیں
ایک لمحے کے لیے ابھرے ہوئے سینوں سے
آپ ہی آپ قبا کھل کے ڈھلک جائے گی
دیکھتے دیکھتے ہر قلبِ جواں کی دھڑکن
وسعتِ میکدۂ وصل کے ہنگاموں میں
قلقلِ مینا کی مانند بھڑک جائے گی
رات بھیگے گی، ہوا اور سنک جائے گی
مرمریں ہاتھوں سے رہ رہ کے چھلک جائے گی
دیکھتے دیکھتے لوگوں کو سرور آئے گا
دیکھتے دیکھتے ہر چیز بہک جائے گی
رات کے ساتھ ہوا اور سنک جائے گی
رات کے ساتھ ہوا اور سنک جائے گی

منظر سلیم

ریل میں ...... !

شاہزادی کوئی پرستان کی ۔
حسن کے قصے سنے تھے بچپن میں
یا کوئی حور باغِ رضواں کی
مجھ سے کتنی قریب ۔ کتنی دور
اُف روایات کی جفا کاری
حسن مجبور ۔ عشق بھی مجبور

درد کو بار بار چھیڑ گئی ۔۔۔
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا
روح کے جیسے تار چھیڑ گئی
کس قدر شوخیاں اداؤں میں
اُف تبسم کی وہ کرن لبِ تر
نور بکھرا ہوا فضاؤں میں

لب پہ خاموشیاں نظر غماز ۔
جیسے رگ رگ میں بھر گئے نغمے
اُف محبت کا سازِ بے آواز
سوچتا ہوں وہ ایک شہزادی
اور میں ایک بے نوا شاعر
ہائے ذوقِ نظر کی بربادی

غلام ربانی تاباں

ایک گھر

دلبروں کا جمگھٹ، گلرخوں کا جھرمٹ
حسن کے کھلونے سانولے سلونے
عشرتوں کی راتیں، دل لگی کی باتیں
آرزو کی سیجیں، عیش کے بچھونے

نازسے، اداسے، حسن دلربا سے
شوخ نازنینیں، جا رہی ہیں سونے
خشک ہو گئے ہیں مفلسی کے آنسو
اب نہیں ہیں باقی "عصمتوں" کے رونے

گم کئے جبیں نے، شرم کے پسینے
کوئی آ رہا ہے "صیدِ عشق" ہونے
لطفِ زیست لینے، دادِ عیش دینے
جامِ آتشیں میں اپنے غم ڈبونے
حسن کے اشارے عشق کے نظارے
شوخیاں، ادائیں کھیلتے کھلونے

کرشن موہن

یہ سنسار کیسا ہے

اے قسمت کی بیٹی کیوں رنجیدہ ہے؟ — بھوکی ماں کی بیٹی کیوں رنجیدہ ہے؟

تو اپنی چتا کو کسی سے کہہ نہ سکی
تو بھی ماں کی بھوک کو آخر سہہ نہ سکی
اے مفلس لڑکی تو اچھوتی رہ نہ سکی
مدھ ماتے جوبن کی پھبن کو کھو بیٹھی
تو اپنے انمول رتن کو کھو بیٹھی
چاندی کے ٹکڑوں پر تن کو کھو بیٹھی

بھوک نے دامن داغ دغیلا کر ہی دیا — چاندی کے ٹکڑوں نے پیٹ کو بھر ہی دیا

اے قسمت کی بیٹی کیوں رنجیدہ ہے
بھوکی ماں کی بیٹی کیوں رنجیدہ ہے

فاقہ اک دن یہ ہر تازگی کھو دیتا
ان ہاتھوں کا رنگ حنائی کھو دیتا
تیری جوانی کی رعنائی کھو دیتا
بھوکی رہ کر راتوں کو تو سو جاتی
فاقوں میں یہ شوخ جوانی کھو جاتی
پھر تو ان داموں تو سستی ہو جاتی

بیچ کے عصمت خود کو جِلا سکتی ہے تو — اپنی بھوکی ماں کو کھلا سکتی ہے تو

اے قسمت کی بیٹی کیوں رنجیدہ ہے؟
بھوکی ان کی بیٹی کیوں رنجیدہ ہے؟

پیٹ کی اگنی بجھ گئی ہے گھبرائے کیوں؟
بیچ کے اپنی عصمت کو شرمائے کیوں؟
ایک جواں دوشیزہ کشت اٹھائے کیوں؟
اک مفلس کی مرجادا کیا عزت کیا؟
بھوکوں کی خاطر دنیا میں غیرت کیا؟
اب فاقہ کش دوشیزہ کی عصمت کیا؟

پیسوں کا ہے عصمت کا گنجینہ بھی — دھن والوں کا مرنا بھی ہے جینا بھی

اے قسمت کی بیٹی کیوں رنجیدہ ہے؟
بھوکی ماں کی بیٹی کیوں رنجیدہ ہے؟

نازش پرتابگڈھی

دو غزلیں

(۱)

تڑپ گیا مری نظروں میں پھر سے رنگِ غزل
وہ آئی جس کی اداؤں میں تھا حیات کا رنگ
وہ آئی جس کے حسیں تبسم کا حسین سا نورج
وہ آئی جس کی ہر اک سانس نغمۂ فردوس
وہ آئی جس نے بنائے تھے مسکرا کے کبھی،
گھنی گھنی سی وہ پلکیں خمار آلود د،
جبیں کہ جس میں دمکتی ہو خود بہارِ چمن
ہر ایک نقرئی آہٹ میں جس کی پوشیدہ
ہر ایک جنبشِ مژگاں پہ ابر کا دھوکا،

وہ آئی جس کے نہ آنے سے تھی نظر بے کل
وہ آئی جس کے تصور سے مسکرائی اجل
بچھے ذہن کے سلیے میں ریشمی آنچل
وہ آئی جس کی صداؤں میں گنگنائے غزل
 ن ا حسین تمناؤں سے حسین محل!
رسیلی آنکھ میں جیسے لگا ہو کاجل
گلابی ہونٹ کہ جیسے کھلا ہوا ہو کنول
عروسِ بادِ بہاری کے پاؤں کی چھاگل
برس پڑے نہ کہیں یہ گھرا ہوا بادل

ڈاکٹر شہرت

---

(۲)

ہے بقدرِ ظرف ہر شے محترم اپنی جگہ
جامِ گل اپنی جگہ اور جامِ جم اپنی جگہ

ہے بصیرت دیکھنے والوں کی چشمِ امتیاز
ورنہ قطرہ بھی نہیں دریا سے کم اپنی جگہ

تو کسی شے کو بھی دنیا میں حقارت سے نہ دیکھ
ذرۂ ناچیز بھی ہے محترم اپنی جگہ

چشمِ گریاں ضبط کا ل ہے نہ حرف آئے کہیں
سیلِ اشکِ غم! ذرا کچھ اور تھم اپنی جگہ

آگیا دامن میں وہ آنسو جو ٹپکا آنکھ سے
گوہرِ نایاب ہے ہر اشکِ نم اپنی جگہ

شمع بھی جلتی رہی پروانے بھی جلتے رہے
عشق میں دونوں رہے ثابت قدم اپنی جگہ

روشن نگینوی

آبشار

خودغرض

گرہ

سفر

طوفان

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

ناہید عالم

خود غرض

آج اُس کی بیوی کے پیٹ میں سے ایک بار پھر پانی نکالا گیا۔ لیکن اس کا پیٹ اب بھی بدستور پھولا ہوا تھا اور پتلی پتلی ٹانگیں، بے چینی سے کمبل کے اندر کلبلا رہی تھیں، اس نے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں "کہاں جاؤں، کیا کروں؟" اس نے گویا خود ہی سے سوال کیا، ہر طرف اندھیرا ہے ــــ بھیانک اندھیرا۔ فرض کی بلند مضبوط دیواریں، انسانیت کی سنگلاخ چٹانوں کا جال ــ کوئی راستہ نہیں ــ کوئی راہ نہیں ــ اُف!! "دفعتاً کسی کے قدموں کی چاپ سُن کر اس نے دھیرے سے اپنی آنکھیں کھول لیں۔ یہ ڈاکٹر تھا۔ "کہیے ڈاکٹر صاحب؟" اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

"جی ــــ جی ہاں، جی ہاں" ڈاکٹر کی آواز سے مایوسی مترشح تھی۔ "ذرا احتیاط کیجیے"

احتیاط ــــ! اس نے اپنی بیوی کے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ سفید سفید بستر پہ ملگجے کپڑوں میں لپٹی لپٹائی، اس کی بیوی کی صورت بے حد ڈراؤنی معلوم دے رہی تھی۔ یہ احتیاط ہی کا تو نتیجہ ہے میرے دوست، اس کا جی چاہا، وہ کہہ دے "میں سات سال سے متواتر اس کی احتیاط کر رہا ہوں۔ سات سال سے، اور تم اس کی شکل دیکھ رہے ہو؟ یہ باہر کو نکلی ہوئی دہشتناک آنکھیں، مُتا ہوا خوفناک چہرہ، پتلی پتلی نوکیلی ٹانگیں، اور یہ پھولا ہوا مشکی سا پیٹ۔ تم اس کی شکل دیکھ کر خوفزدہ ہو ــ ڈر رہے ہو میرے دوست! ٹھیک ہے ــــ تمھیں ابھی اپنے عجیب و غریب پیشے کو اختیار کئے بہت کم عرصہ ہوا ہے، اس سے کیا ہوتا ہے کہ تم بے حد قابل ہو ــــ، تم قابل ہو، لیکن ڈاکٹر نہیں ــــ صرف ایک انسان ــــ ڈاکٹر انسان نہیں ہوتا۔ وہ بہت اطمینان سے فطرت کی ستم ظریفی کا مضحکہ اُڑا سکتا ہے ــــ، لیکن تم انسان ہو اور میری بیوی کی شکل دیکھ کر ڈر رہے ہو۔ شاید تمھاری نئی زندگی میں اس قسم کا یہ پہلا کیس ہے، لیکن یاد رکھو کہ اگر تم یوں ڈرتے رہے تو کوئی بھی تمھیں اپنا معالج بنانے کو تیار نہ ہوگا۔ اور پھر ــــ، تمھاری بیوی کی صورت فاقے کرتے کرتے ڈراؤنی ہو جائیگی، ڈراؤنی اور دہشتناک ــــ، پھر تم بھی زندگی سے بیزار ہو جاؤ گے۔ اپنی بیوی سے بیزار ہو جاؤ گے، خود اپنے آپ سے بیزار ہو جاؤ گے لیکن یہ سب کچھ تمھیں کیوں بتا رہا ہوں؟ کیا میں خود اپنی زندگی سے مایوس ہوں؟ نہیں نہیں، میں زندگی سے بیزار نہیں ــــ بیزار ہوتا تو متواتر سات سال تک اپنی بیوی کی یوں احتیاط نہ کرتا، یوں ڈاکٹروں کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرتا، ساری ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتا۔ شادی کے ان ابتدائی ایام میں بھی جب ساری دنیا ایک مسلسل مسکراہٹ بن جاتی ہے، جب فضا سے رنگینی چھلکی پڑتی ہے اور جب رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی سے نور کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں، اور مسرت سے سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا، دبی دبی نازک سرگوشیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تب بھی میں ان باتوں سے کوسوں دور تھا۔ رات کے پُرکیف سناٹے میں کھانسی کی کرخت آواز فضا کو بُری طرح چیر کر رکھ دیتی، مسلسل چھینکوں کی رفتار کسی طرح مدھم نہ ہوئی۔ اور چٹختی ہوئی ہڈیوں کی آوازیں، میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بنکر گھسنے لگتیں ــــ، لیکن میں اُٹھتا اور حتی الامکان اس کی تیمارداری کرتا ــــ اب تک کر رہا ہوں، راتوں کی نیند میرے لئے حرام ہو گئی ہے ــــ کیا میں اپنی زندگی سے مایوس ہوں دوست، بولو ــــ"

لیکن ڈاکٹر جا چکا تھا ــــ، اسے کیا غرض پڑی تھی کہ اُس کی داستان سنتا ــــ، خود غرض انسان، اس نے نفرت سے شلنگ کے نوٹ لیے۔ اُسے روپوں کی ضرورت ہے، اور مریض کو دوائیوں کی ــــ لیکن وہ ــــ پچھلے چند دن سے ہمدردی کے

دو بول سننے کے لئے بھی ترس گیا تھا، ایک بے معنی سی کرب آمیز خاموشی —— جیسے کسی پُر اسرار قوت نے سب کے منہ کو قفل لگا دیا ہو —— اپنی محنت کے صلے میں، ہمدردی کے دو بول، پژمردہ امنگوں میں کتنا جوش بھر دیتے ہیں۔ وہ اب تک اپنی ہمدیوں کے سہارے اپنی زندگی گذار رہا تھا۔ وہ مر گیا ہوتا، بھٹک گیا ہوتا، اگر یہ ہمدردیاں اُس کی راہ میں، ایک شمع نہ بنجاتیں۔

کبھی کبھی راتوں کو، بیچارے کی کیتلی میں اُبلتی ہوئی بھنبھناہٹ کی تیز لَو اُسے جھنجھلا جھنجھلا کر عجیب و غریب خیالات سوچنے پر مجبور کر دیتی۔ وہ بستر پر اوندھا ہو کر سوچنے کی کوشش کرتا، مگر اس کی بیوی کی سوکھی سوکھی باہنوں میں حسین رنگ برنگی چوڑیاں تیزی سے بج اُٹھتیں۔ چھن، چھن، چھنا چھن —— اُف! وہ اُٹھکر بیٹھ جاتا۔ بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ وہ ان رنگ برنگی خوبصورت چوڑیوں کو توڑ ڈالے —— "مجھے سونے دے کمبخت! تیری چوڑیوں کی جھنجھناہٹ میں، اتنا کیف نہیں ہے —— سو جا —— سو جا، اور مجھے بھی سونے دے!"

وہ بے بسی سے اپنا سر تھام لیتا۔ لیکن پھر وہی بے رس جھنا کے —— "سوئے گی بھی، یا یونہی پریشان کئے جائے گی" وہ گھٹی ہوئی آواز میں جھنجھلا کر بک دیتا لیکن فوراً ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگتا اور وہ اچانک بڑھ کر "رضو —— تم قصوروار نہیں ہو —— ننھی لڑکی!" اس کے نکیلے سے زرد چہرے کو تھام لیتا۔

"اماں نے مجھے ایک کمزور انسان سمجھکر میرے احساسات کی پروا کئے بغیر، میری تمناؤں کو کچل کر، میری آرزوؤں کا گلا گھونٹ کر میری شادی تمہارے ساتھ کر دی ہے" وہ سوچتا "میں کمزور سہی لیکن اتنا ذلیل نہیں کہ ایک خود بخود گرتے ہوئے انسان کو دھکا دیکر گرا دوں، جو خود ہی گر رہا ہو اس کے لئے کسی کا دھکا دینا یا نہ دینا برابر ہوتا ہے، لیکن دھکا دینے والے کو تو کوئی دلیر نہیں کہتا۔ میں تمہیں گرنے سے بچا لوں گا، تمہیں سہارا دوں گا اور اس قابل بنا دوں گا کہ تم خود کسی کا سہارا نہ بن سکو۔ میں تمہاری نحیف ہڈیوں میں طاقت ہی طاقت بھر دوں گا۔ تمہاری مردہ رگوں میں خون اُبلنے لگے گا۔ میں تمہیں سہارا دونگا رضو، اپنے لہو کا آخری قطرہ تک میں تمہارے جسم میں منتقل کر دوں گا"

ہر روز دفتر سے واپسی پر ایک نئے ڈاکٹر کے ہمراہ، نت نئی دوائیوں اور انجکشنوں کا بنڈل تھامے وہ برآمدے کی سیڑھیاں بہت تیزی سے طے کرتا اور سیدھا رضیہ کے کمرے میں چلا آتا۔ الماری میں بھری ہوئی دوائیوں کے درمیان اس بنڈل کو کھول کر رکھ دیتا۔ "آج میں نے کرنل سیٹھی سے ذکر کیا تھا، یہ دوائیاں انھوں نے تجویز کی ہیں، ابھی تمہیں دیکھنے آتے ہی ہونگے اور یہ انجکشن فیروز کی تجویز کردہ ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کی بیوی کا بھی یہی حال تھا۔ اور یہ دوائی ——"

"میں کہتی ہوں بیٹا، تو کیوں روپے کا ناس مار رہا ہے ——"

"ناس؟" وہ گھوم کر دیکھتا "روپے سے زیادہ مجھے کسی کی زندگی عزیز ہے اماں!"

"مگر بیٹا، یہ دُکھ بیماری تو انسان کے دم کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے"

"اور اس لئے اس کا علاج نہیں کرنا چاہیے، کیوں؟" وہ طنز سے ہنس دیتا۔ "آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں اماں۔ جائیے، آپ جا کر حساب لگائیے کہ سلمیٰ کی شادی میں کتنا خرچ آئیگا، امجد کو کالج بھیجنے کے لئے کتنے روپے درکار ہیں اور امینہ کی ساری اور کانوں کے آویزوں پر کتنی لاگت آئیگی؟ جائیے، آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں، میں ان سے خود نمٹ لوں گا"

"اب کیا حال ہے رضو؟" وہ اس کی مسہری کے نزدیک کرسی گھسیٹ لیتا۔

"ہوں —— اچھا ہے" وہ کراہتے ہوئے کہتی۔

"اچھا ہے —— وہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ "یہ اچھا ہے؟ دن بدن تو سوکھتی جا رہی ہو —— میں جا کر دیکھتا ہوں کہ کرنل سیٹھی اب تک کیوں نہیں آئے؟"

"کتنا نیک ہے غریب"

"بھئی میں تو کہتی ہوں، اتنی بدصورت اور بیمار بیوی کے لئے اس قدر قربانی کوئی بھی نہیں کرسکتا۔"

"اپنا آرام، کھانا، پینا، سیر و تفریح، سب کچھ بھول بیٹھا ہے بیوی کی خاطر، شرافت کا پُتلا ہے بالکل"

"نیکی کا فرشتہ کہو" کوئی تو حد سے بڑھ جاتا۔

چاروں طرف اس کے ہمدرد ہی ہمدرد بھرے پڑے تھے۔ نیکی اور شرافت کا "ڈپلوما" اتنی آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہے، اس کا اُسے گمان بھی نہ تھا۔ صرف چند مہینوں کی نیند، چند مشہور ڈاکٹر اور دوائیوں سے بھری ہوئی الماریاں، کتنا آسان طریقہ ہے فرشتہ بننے کا — بیوی کے ذریعہ فرشتہ — یا ایک، دو، تین —، بیسوں ڈاکٹر اُسے دیکھ چکے تھے۔ مگر کوئی بھی تو یہ نہ بتا سکا تھا کہ اُسے مرض کیا ہے؟ اس کی صحت دن بدن گرتی جارہی تھی۔ بے جان، سیاہ جلد، اب زرد پڑگئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ کھانسی، زکام۔ جوڑوں میں درد اور پیٹ پر ورم۔ عرصہ تک وہ انہی بیماریوں میں پھنسی رہی، تڑپتی رہی اور کُلبلاتی رہی، اور اب تو اُس کے پیٹ میں پانی بھی بھرنے لگا تھا۔ نہ جانے کس طرح، اس کے پیٹ میں آپ ہی آپ پانی جمع ہوجاتا اور پھولے ہوئے پیٹ کو ہلانے جُلانے میں اُسے بیحد دقت ہوتی۔ کروٹ تک بدلنے میں اُسے اپنی پوری طاقت صرف کردینا پڑتی۔ نحیف و ناتواں ٹانگیں اُس کے پیٹ کے بوجھ کو نہ سہار سکتیں اور وہ بیتاب ہوکر یوں چیخنے لگتی، گویا اُسے کوئی ذبح کئے دے رہا ہو۔

دن بھر دفتر میں سر کھپانے کے بعد جب وہ گھر لوٹتا تو رضیہ کے چنگھاڑنے اور دھاڑنے کی آوازوں سے اُسے بیحد کوفت ہوتی، وہ تھکے ہوئے قدموں سے الماری کی طرف بڑھتا۔ معاً اُسے محسوس ہوتا گویا بیشمار آنکھیں اُسے ہمدردی سے دیکھ رہی ہیں اور اسکے ہی لمحے اس کی تمام کوفت، ساری تھکن دور ہوجاتی اور وہ بڑی مستعدی سے کوئی نئی دوائی — خریدنے — باہر نکل جاتا "پہلے چائے تو پی لیجیے بھائی جان" سلمیٰ کی آواز اس کا تعاقب کرتی۔

"ابھی آکر پی لوں گا" وہ مڑے بغیر جواب دیتا اور تیزی سے قدم بڑھانے لگتا، کئی سال اسی چکر میں گذر گئے۔ لیکن اب پانچ چھ مہینے سے رضیہ کی حالت بہت تشویشناک ہوگئی تھی۔ بھرے پُرے گھر میں ایک عجیب سی خاموشی مسلط رہنے لگی ایک پُر اسرار سناٹا، جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔ ہر چیز پُر حسرت نظر آتی۔ اداس اور پھیکی! ہنستے کھیلتے بچوں اور گھر کے تمام افراد پر ہمہ وقت گھبراہٹ اور وحشت طاری رہتی۔ گویا کسی غیر متوقع اور اچانک حادثے سے سب لوگ پریشان ہوگئے ہیں اور وحشت کے زیر اثر ایک دوسرے سے بولنے تک سے قاصر ہیں۔ اس نے گھبرا کے دفتر سے چھٹی لے لی۔ چوبیس گھنٹے وہ ڈاکٹروں اور دوائیوں میں گھرا رہتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ تمام تمام رات اُسے رضیہ کے سرہانے بیٹھکر گذار دینا پڑتی۔ اس کی مسہری کے پہلو میں کرسی ڈالے وہ اس پر بیٹھا رہتا، بیٹھا رہتا۔ دوائی پلانے، بخار دیکھنے کے علاوہ مالش، ٹکور، سینک، سبھی کام وہ اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔ اور سب کاموں سے فارغ ہوکر وہ جب یونہی سُستانے کی غرض سے، کرسی کی پشت پر اپنا سر ٹکا کر اونگھنے لگتا تو ——

"پانی!" رضیہ کی نحیف آواز، اس کے کانوں کے لئے کسی بے ڈھب ڈھول کی چیختی ہوئی آواز سے کم نہ تھی۔

اُوہ! وہ سنبھل جاتا، اور نیند سے بوجھل آنکھوں کو زبردستی کھولتے ہوئے، میز پہ رکھی ہوئی صراحی کی جانب بڑھنے لگتا کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ اس کی نیند سے بھری ہوئی آنکھیں کھولے نہ کھلتیں اور وہ اسی طرح بند آنکھوں سے ٹمپریچر لینے یا دوائی پلانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا تو کبھی دیوار سے، کبھی کرسی سے کبھی ڈریسنگ ٹیبل سے ٹکرا جاتا۔ اور تقلیں پڑ کر گر پڑتی۔

"بھائی جان، آخر نرس کس مصرف کی دوا ہے؟" ریشو بھائی سے گہرے کی آواز تنگ زور سے چیخی۔

"نرس؟ ہنہ! نرس کو بھلا کیا درد ہوسکتا ہے؟ اور ـــــ تم جانتی ہو، بیمار کو تیمارداری سے زیادہ محبت کی ضرورت ہے۔"
وہ پھر کرسی پر گر پڑتا ـــــ
"ٹھیک" غنودگی میں اس کا سر زور سے کرسی کی پشت سے ٹکرا جاتا۔
"بھائی جان، خدا کے لئے جائیے، میں خود بیٹھ جاؤنگی بھابی کے پاس۔ اس طرح آخر آپ کب تک جی سکیں گے؟"
امینہ زبردستی اُسے کرسی پر سے اُٹھا کر خود اس کی جگہ پُر کرلیتی، مگر چند دنوں کے بعد، اُسے پھر اپنی جگہ کو پُر کرنا پڑتا۔
"اونہہ، کبھی ہوتے ہیں بیمار ـــــ اب بیماری کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان دوسرے کو حیوان ہی سمجھنے لگے ـــــ"
امینہ چبا کر کہتی۔
"بھئی غضب کی چڑچڑی عورت ہے۔ اب بھلا میں بھی تو ہوئی تھی پارسال بیمار، مجھے چڑچڑے پن نے گھیرا تو نہیں؟"
سلمیٰ بڑبڑانے لگتی، لیکن ان جلی کٹی باتوں کے باوجود اُسے یوں محسوس ہوتا گویا سلمیٰ اور امینہ کی آنکھیں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں "بڑے ہمت والے ہیں بھائی جان آپ!" میرے بس میں ہو تو آپکو "نوبل پرائز" دے ڈالوں سچ سچ "وکٹوریہ کراس" دینے کو جی چاہتا ہے آپکو۔ "وکٹوریہ کراس" وہ آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کرلیتا۔ اور چشم زدن میں اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے لئے بیشمار جگمگاتے ہوئے تمغے آویزاں ہیں ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے۔ اور پھر بڑے بڑے "نوبل پرائز ونر" اُسے اپنے سامنے پانی بھرتے دکھائی دینے لگتے۔ وہ غرور سے اپنی گردن اکڑا لیتا۔ رات کی پُرسکون فضا میں ہلکے پھلکے قلم کو تھام کر، چند دستے کاغذوں کے لکھ دینا، اتنا مشکل نہیں ہوتا۔ کہیں دم توڑتے ہوئے مریض کی تیمارداری۔ اور پھر جب اس کے لئے سوائے ہمدردی کے، دلیں اور کوئی جذبہ بھی نہ ہو۔ کتنا کٹھن ہے یہ کام! کیا کہا، وکٹوریہ کراس؟ اوہ ہو تم بے شک دلیر ہو۔ بہادر ہو۔ لیکن تم نے وکٹوریہ کراس جس صلہ میں حاصل کیا ہے، وہ اتنا محنت طلب نہیں۔ یہی نا کہ تم نے میدان جنگ میں داد شجاعت دکھائی۔ لیکن تم نے یہ سب کچھ، یقیناً کسی کھوکھلے جذبے کے زیر اثر نہیں کیا۔ تمھیں روپیہ چاہئے تھا، تم شہرت کے بھوکے تھے۔ اس کے علاوہ زندگی سے مایوس انسان، موت کے منھ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اتنا نہیں گھبراتا۔ مگر میں ـــــ "اُسے اپنی محنت کے صلے میں "نوبل پرائز" اور "وکٹوریہ کراس" دونوں چیزیں ہیچ معلوم دیتی تھیں اور جب وہ کھڑکی سے باہر نظر ڈالتا، اس کی ہمت، یاس میں تبدیل ہوجاتی۔ اُف، یہ مسکراتی ہوئی کائنات ہنستے ہوئے پھول، جھومتے درخت، سڑک کے اُس پار، جانی پہچانی ایک زرد رنگ کی کوٹھی ـــــ، دھڑکتی ہوئی زندگی۔ اور اُس کے اپنے گھر میں کیا تھا؟ ایک جمود ـــــ ایک جھنجلاہٹ، مایوسی، کرب، اضطراب ـــــ، وہ جھنجلا جاتا۔ مجھے گھر سے نکلے آج کتنے ہی دن ہوگئے ہیں۔ شامیں کتنی بے کیف اور پھیکی گذر رہی ہیں لیکن آج ـــــ آج میں اپنی شام یوں برباد نہ کرونگا۔ اور پھر فرزانہ کتنی دبلی بھی ہو چکی ہے، لیکن اپنی بیوی پر نظر پڑتے ہی اُسے ایک دھکا سا لگتا۔ وہ سوکھا ہوا جسم اُس کی راہ میں ایک بہت بڑی چٹان سے کم نہ تھا۔ "تم؟" جیسے کوئی اُسکا مضحکہ اُڑانے لگتا۔ "تمھارے چاروں طرف بیڑیاں ہی بیڑیاں ہیں دوست۔ فرض کی بیڑیاں، انسانیت کی بیڑیاں ہمدردی کی بیڑیاں، اور ان بیڑیوں کے جال میں تم اس بُری طرح اُلجھ گئے ہو کہ اب نکل بھی نہیں سکتے۔"
"لیکن میں اس جال کو بکھیر دونگا۔ میں توڑ دونگا اسے" وہ اس طرح باغی ہونے لگتا۔
"مگر دوست، وہ تمھاری انسانیت، شرافت۔ اور تم جانو، دنیا انسان حال کو دیکھتے ہیں، ماضی کو نہیں۔"
"اوہ!" وہ بے بسی سے کرسی پر گر پڑتا "فرزانہ ـــــ" اس کے ہونٹ کپکپانے لگتے ـــــ "فرو ـــــ!"
کافی ہاؤس کی فضا اُس دن بھی حسب معمول رنگینی سے معمور تھی۔ ایک عجیب سا سکون اور طمانیت اُسکی روح پر چھا رہا تھا۔

چھائے جا رہا تھا اور وہ بڑی بے نیازی سے سگرٹ کا دھواں ہوا میں اُڑاتا ہوا، کافی ہاؤس کی چھت کو تک رہا تھا "کافی ہاؤس کی فضا کتنی دلکش ہوتی ہے" وہ سوچ رہا تھا ——— "کاش دنیا میں صرف دو چیزیں ہوتیں ——— کافی ہاؤس اور سگریٹ ——— سگرٹ اور ———"

اوہ! وہ محمود کے ساتھ ایک خوبصورت سی لڑکی کو اپنے نزدیک سے گذرتے دیکھکر چونک پڑا۔ محمود اُسے محو دیکھ کر شاید نظر انداز کر گیا تھا، مگر جب وہاں کے بڑھتے ہوئے شوقین لوگوں کے سیلاب میں اُسے کہیں جگہ نہ ملی تو وہ بغیر کچھ کہے سنے اس کی میز پر آ بیٹھا "یہ میری بہن ہے فرزانہ ——— اور یہ افضل ——— میرا دوست!" اس نے ایک سیکنڈ میں تعارف کروا دیا۔

فرزانہ بہت دلچسپ لڑکی تھی، اس نے سوچا کہ اگر وہ فرزانہ کی دلچسپی اپنی طرف منعطف کرا لے تو کافی ہاؤس اور سگرٹ کے علاوہ بھی وقت کافی خوبصورتی سے گذر سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنی ساری قابلیت فرزانہ کی دلچسپی سمیٹنے میں صرف کر دی "کبھی کبھی آیا کیجیے نا، آپ کی کوٹھی کے بالکل سامنے رہتے ہیں ہم لوگ" چلتے ہوئے فرزانہ کہنے لگی۔

"شکریہ!" وہ زیر لب مسکرا دیا۔ اور اب کافی ہاؤس کو تج کر وہ ہر روز فرزانہ کے ہاں جانے لگا۔ نہیں آپ غلط سمجھے محبت وغیرہ کا تو وہ کبھی قائل ہوا نہ تھا، اس کا خیال تھا کہ جب ایکدن شادی ہی کرنا ٹھہری تو بھلا اس جھمیلے میں پڑنے سے کیا فائدہ؟ ہاں فرزانہ اُسے اتنی اچھی لگی تو وہ اُسے اپنی بیوی بنانے کے لئے متفکر رہنے لگا، متفکر اس لئے کہ وہ اپنے قدامت پرست گھرانے سے بے خبر نہ تھا۔

"میں مر جاؤں گی، مگر تیری اُس چہیتی کو گھر میں نہ لاؤں گی" یہ اس کی ماں تھی، وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس کی ماں فرزانہ جیسی حسین اور باذوق لڑکی کو بہو بنانے سے انکار کر دیگی۔ لیکن وہ سید تھا اور فرزانہ شیخ، جیسے اللہ میاں نے اپنے ہاتھوں سے نہ بنایا تھا۔

"افضل صاحب ذرا اس شیشی کا ڈھکن تو کھول دیجیے" وہ چونک پڑا ——— نرس ایک نئی دوائی کی شیشی تھامے کھڑی تھی۔

"لاؤ ——— اوہ، نہیں کھلتا، نہیں کھلتا" اس نے مجبوراً شیشی واپس کر دی۔

"میرے اللہ یہ دن بھی دیکھنا تھا! کبھی یہ بازو کتنے طاقتور تھے ——— کس قدر مضبوط ———! اور اُسے یاد آیا کہ شادی سے پہلے شام کو گھنٹوں ٹینس کھیلنے کے بعد، وہ بلا تکان کتنے ہی ڈنڈ پیل جاتا تھا۔

"بس، خدا کے لئے بس کرو افضل" کبھی تو فرزانہ چلا پڑتی۔

"جانتی ہو ورزش سے صحت بنتی ہے، بازو مضبوط ہوتے ہیں ——— اور ——— اور ——— تم تو جانتی ہو!"

فرزو شرما کے مسکرا دیتی۔

"مگر اب؟" اس نے مضمحل ہو کر اپنا سر جھٹک دیا ——— "اف! لیکن ——— یکایک اُسے جوش آ گیا ——— "مجھے کسی کی پروا نہیں، میں اس چٹان کو اپنی راہ سے ہٹا دوں گا ——— اس گہری کھائی کو پھلانگ جاؤں گا ——— مجھے کسی کی پروا نہیں ——— ہنہ!" اس نے غصّے سے اپنی بیوی کو دیکھا جس کا پلنگ کھڑکی کے سامنے صاف نظر آ رہا تھا ——— "سوائے ایک خفیف سی سانس کے اس کے پاس دھرا ہی کیا ہے؟ لیکن یہ خفیف سی سانس بھی میری راہ میں کسی چٹان سے کم نہیں۔ ایک کمزور عورت ہوتے ہوئے بھی ——— کتنا کمزور!" اُسے اپنی شکست کا بری طرح احساس ہونے لگا اور اچانک اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس کی سانس کا یہ کمزور دھاگا اگر ٹوٹ جائے تو اس کے سر سے کتنا عظیم بوجھ اتر جائیگا ——— کتنا عظیم ———!

معاً اندر کے کمرے میں سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ چونک پڑا۔ اس کی راہ میں حائل وہ مہیب چٹان

مرزا ادیب

گرہ

جیسے ہی اُس کی شکل میری نگاہوں کے سامنے آتی میرے دل میں رحم اور ہمدردی کا ایک طوفان برپا ہو جاتا اور میں بے اختیار سوچنے لگتا کہ یہ شخص اب تک زندہ کیوں رہ سکا ہے اور دنیا کی وہ کونسی چیز ہے جو اُس کی زندگی کی تنگ و تاریک راہوں میں امید کی روشنی پھیلا رہی ہے۔ لوگ اُسے ایک کلرک یا زیادہ سے زیادہ ایک سنجیدہ نوجوان کی حیثیت سے جانتے تھے لیکن میں جب یوسف کو جانتا تھا وہ صرف ایک کلرک، صرف ایک سنجیدہ نوجوان ہی نہیں تھا، بلکہ کلرکی اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک کُھلا ہوا انسان بھی تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ میری دلچسپی کا مرکز اُس کی وہ مجروح، الم نصیب، اور حسرت زدہ شخصیت تھی، جسے وہ نہایت خاموشی سے اپنے کندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھر رہا تھا۔

میں نے سب سے پہلے، اسے اُس وقت دیکھا تھا جب وہ ماں باپ کے مرنے کے بعد زندہ رہنے کے لئے کہیں سرا ڈھونڈ رہا تھا۔ اپنے چچا کے ہاں اُسے زندگی کا آسرا تو مل گیا، لیکن وہ چیز نہ مل سکی جس کی اُسے سب سے زیادہ ضرورت تھی چچا اور چچی کی مسلسل جھڑکیوں میں جلد ہی اُس کے معصوم دماغ نے محسوس کیا کہ یہ لوگ روٹی اور کپڑا دے سکتے ہیں۔ پدرانہ شفقت اور مادرانہ محبت نہیں دے سکتے اور اس صدمے نے اس پر اتنا اثر کیا کہ وہ رات دن اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگا۔ مگر ظاہر ہے اس قسم کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اسے نہ تو زندگی سے کوئی محبت رہی، اور نہ موت سے خوف۔ کس مپرسی کے شدید احساس نے اُس کے سُلگتے ہوئے دماغ پر برف کی تہہ سی جما دی اور وہ اپنے اندر اطمینان کی کیفیت محسوس کرنے لگا! افسوس یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ اُس کا چچا زاد بھائی بازار سے طرح طرح کی مٹھائیں لا کر کھایا کرتا تھا اور ان مٹھائیوں کو دیکھ دیکھ کر اُس کے مُنہ میں پانی بھر آتا تھا اور وہ اپنے دل کو بہتیرا سمجھاتا کہ خدا نے اُسے مٹھائی کے لائق نہیں بنایا، لیکن جب بھی وہ صفدر کے ہاتھوں میں مٹھائی دیکھتا دریا کی ایک تیز و تند لہر کی طرح ایک پُر زور اور جنون انگیز خواہش اُس کے ذہن میں موجزن ہو جاتی اور وہ دیر تک بےچینی کے عالم میں اپنی اُنگلیاں مروڑتا رہتا۔ ایک دن اُس کی چچی نے اُس کی ہتھیلی پر مٹھائی کا چھوٹا سا ٹکڑا رکھ دیا۔ یہ مٹھائی کھانے کے بعد وہ دیر تک اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتا رہا اور اُس رات جب وہ سونے کے لئے چارپائی پر لیٹا تو اُس کا دماغ ایک سخت کشمکش میں گرفتار تھا۔

انہی دنوں اس نے اپنے چچا کو نوٹوں کا ایک بنڈل تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی مٹھائی کی تیز خوشبو طوفان کی طرح اُس کے دماغ میں پھیل گئی۔ خواہش کی شدت میں اُسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کیا کر رہا ہے، اور اس کا انجام کیا ہوگا، یہاں تک کہ وہ گھر سے دور ایک باغ کے اندر بینچ کے اوپر بیٹھا تھا اور اُس کے سامنے رومال میں مٹھائی کی رنگ برنگی ڈلیوں کا ڈھیر پڑا تھا، جب تک اُس کا ہاتھ مُنہ اور مٹھائی کے ڈھیر کے درمیان حرکت کرتا رہا، وہ ہر اُس چیز سے بے نیاز رہا جس کا تعلق اُس کے مستقبل سے ہو سکتا تھا۔ یہ چند لمحات اُس کی زندگی کے مسرور ترین لمحات تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ساری کی ساری مٹھائی ختم ہو گئی۔ اور جب اُس کی نظر رومال کی اُس گرہ پر پڑی جس میں اُس نے روپیہ کے نوٹ کا بقیہ سرمایہ باندھ رکھا تھا تو اُس کے اپنے دماغ میں ایک کرب ناک تصور گرہ کی شکل اختیار کرنے لگا۔ درخت کا سہارا لے کر اُس نے اَدکھلی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھا۔ فضا میں دور دور تک نوٹوں کے بنڈل لہرا رہے تھے اور اُن کے اوپر

مٹھائی کی ڈلیاں ناچ رہی تھیں۔ اس کے بعد مٹھائی کی ڈلیوں اور نوٹوں کے درمیان، دائرے سے بنتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے اس کے قریب آ آکر غائب ہونے لگے۔ نیند کے بوجھل سلیپے سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں ابھی ابھی سوئے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اُسے محسوس ہوا جیسے درخت کی ایک شاخ اُس کے بازو کے گرد لپٹ گئی ہے درد کی شدت سے وہ چیخ مار کر جاگ اُٹھا۔ سامنے اس کا چچا کھڑا تھا جس نے مضبوطی سے اُس کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ گھر جا کر چچا نے زدوکوب کیا اس کے اپنے جسم کے مختلف حصوں میں تکلیف ہونے لگی مگر یہ تکلیف ناقابل برداشت نہیں تھی۔ ناقابلِ برداشت تکلیف اس وقت ہوئی جب اُس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے گھر والوں، محلے والوں بلکہ سارے شہر کی نگاہوں سے گر چکا ہے وقت کے احساس نے اس کی دماغی گرہ کو اور مضبوطی سے کس دیا۔ وہ بظاہر گم سم رہنے لگا، وہ اس زخم رسیدہ خاموشی میں اضطراب کا ایک طوفان برپا تھا۔ سودا خریدنے کے لئے بازار میں سے گزرتے وقت یا اپنے چچا کے چھوٹے لڑکے کو اسکول سے لاتے ہوئے جب بھی لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہیں اُس پر پڑتیں تو وہ سر جھکا لیتا، لوگوں کی نظروں کا مقابلہ کرنے کے لئے اُس کے دل میں طاقت نہیں تھی!۔ آخر کار ذہنی کشمکش نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ چچا کے گھر سے نکل جائے۔ چنانچہ وہ ایک دن گھر سے نکل بھاگا اور اپنے ایک دوست کی وساطت سے سینما کے اُن ملازموں میں شامل ہو گیا جن کا کام یہ تھا کہ ہر نئی فلم کے اشتہار شہر کی دیواروں پر چسپاں کرتے پھریں۔ اب اُس کی حالت اچھی تھی مگر جب بھی وہ اشتہاروں کا بنڈل کندھے پر اُٹھاتا اُس کے سامنے نوٹوں کا بنڈل پھرنے لگتا اور اُسے اپنے وجود سے اور زیادہ نفرت ہو جاتی۔

چند ماہ کے بعد وہ سینما کی نوکری سے بیزار ہو گیا۔ اس ملازمت سے علیحدہ ہو کر وہ ایک شاہ صاحب کے ہاں نوکر ہو گیا یہاں اُس کے ساتھ کسی قدر بہتر سلوک ہو رہا تھا، لیکن ذلت کا وہ بھیانک تجربہ جو چچا کے یہاں اس کی زندگی میں داخل ہو چکا تھا سائے کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، وہ یہ حقیقت فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ذلیل ہو چکا ہے اور ذلیل رہے گا۔ کبھی کبھی اُسے خیال آتا تھا کہ جب سینما کا اشتہار بانٹنے والے چوری کو کوئی عیب نہیں سمجھتے تو پھر وہ کیوں ایک مرتبہ چوری کرنے کے بعد اپنے آپ کو اتنا ذلیل سمجھنے لگا ہے۔ اور اسنے یہی سوچ کر بچارہیں شاہ صاحب کی جیب سے ایک روپیہ کا نوٹ اُڑا لیا۔ رات کی تنہائی میں جب اُس نے نوٹ کو دیکھا تو اُس کے ہاتھ کانپنے لگے، وہ دل ہی دل میں کہنے لگا تم ذلیل ہو تم نے چوری کی ہے، تم نے جرم کیا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے نوٹ کے اوپر بادشاہ کی تصویر شاہ صاحب کی شکل میں بدل گئی۔ شاہ صاحب کے ہونٹ حرکت کرنے لگے اور ایک گرجتی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ تم ذلیل ہو میری جیب سے نوٹ چرا کر اب اُسے دیکھ رہے ہو۔ چوری کرنا بہت بڑی ذلت ہے اور تم نے اس ذلیل جرم کا ارتکاب کیا ہے" اُس کے دماغ میں کھولتا ہوا پانی لہریں لینے لگا۔ اس نے نوٹ کو زمین پر پھینک دیا اور کھڑکی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے کے بعد جب اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا تو بے اختیار اُس کی نظر چمکتے ہوئے نوٹ پر پڑی۔ نوٹ مٹھائی کا ایک ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا اور مٹھائی کے تصور کے ساتھ ہی اُس کی سوکھی ہوئی زبان اُس کے سوکھے ہوئے حلق میں خوشبودار میٹھا س کے قطرے ٹپکنے لگے، وہ سوچنے لگا، صبح شاہ صاحب کے ہاں ان کے دوست کے گھر سے فرنی آئی تھی، ایک پوری پلیٹ بھری ہوئی جسے وہ جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکا تھا اور اچانک اُسے خیال آیا فرنی سے بھرا ہوا تھال گلی کے نکڑ میں حلوائی کی دکان میں بھی نظر آیا کرتا ہے۔ وہ جب چاہے فرنی خرید کر کھا سکتا ہے اور اس نے جھک کر نوٹ اُٹھا لیا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا کہ وہ حلوائی کی دکان کے سامنے بیٹھا فرنی کھا رہا ہے۔ مزیدار، خوشبودار فرنی خوبصورت چاندی کے ورق سے مزین۔ اُس کی زبان دانتوں کے پیچھے چاروں طرف پھرنے لگی، اُس نے اپنی نگاہیں سامنے کھڑکی پر جما دیں۔ بجلی کی روشنی میں نوٹ کا سایہ کھڑکی کے پٹ پر لرز رہا تھا۔ روشنی میں ایک بدنما دھبا اور یکایک اُس کے دماغ میں

چچا کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ یوسف! چوری کر کے تو نے ہمارے خاندان کی پیشانی پر بدنما داغ لگا دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں تلے دھبے ہی دھبے ناچنے لگے جھنجھلا کر گھبرا کر اس نے نوٹ پرے پھینک دیا اور چند منٹ کے بعد اُسے وہیں رکھ دیا جہاں سے نکال کر لایا تھا۔ اس کام کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ گیا لیکن اس کا دماغ ادھ جلے کوئلے کی طرح سلگتا رہا تھا! اس ذہنی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔ گھر کے کام کاج سے جب بھی فرصت ملتی کتاب کے مطالعے میں غرق ہو جاتا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے لکھنے پڑھنے میں کافی ترقی کر لی اُس زمانے میں مجھ سے ملا تو کہنے لگا، تم نے دیکھا ہوگا خوشحال گھرانوں میں ملازم لوگ گھروں کی صفائی کر کے کوڑا کرکٹ باہر پھینک دیتے ہیں، میں بھی کوڑا کرکٹ ہوں جسے دنیا بنانے والے نے اپنی خوبصورت دنیا سے الگ کر کے خاک کے ڈھیر میں پھینک دیا ہے۔ اب خاک کا ڈھیر ہی میرا اصلی مقام ہے، نہ جانے خدا نے مجھے کیوں پیدا کیا ہے اگر ایک گنجان درخت کی پتّوں سے بھری ہوئی ایک شاخ سے صرف ایک پتہ علٰحدہ کر دیا جائے تو پتّوں کی زیادتی میں کیا کمی آ سکتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں میرے پیدا نہ ہونے سے دنیا میں کیا فرق پڑ سکتا ہے ——؟ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے۔ میں اسے ستم ظریفی ہی کہوں گا —— تم ہی بتاؤ اور کیا کہوں؟ اور کیا کہہ سکتا ہوں؟ -

ایک سال کے بعد وہ ایک بینک میں کلرک بن گیا: کلرک بننے کے بعد اس کے چہرے سے کشمکش کے اثرات کسی قدر دور ہو گئے! اب وہ ایک ایسی کشتی بن چکا تھا جسے دریا سے باہر نکال کر ساحل سے دور کسی جگہ مضبوطی سے باندھ دیا گیا ہو، وہ صبح سے لیکر شام تک بینک میں رہتا اور پھر شام کو گھر آ کر مطالعے میں مصروف ہو جاتا۔ اُس کے دماغ میں توازن پیدا کرنے کے لئے مجھے ایک ہی طریقہ سوجھا اور یہ طریقہ تھا شادی۔ چنانچہ ایک جگہ اُس کی شادی کی بات چیت کرنے لگا۔ بات ابھی کسی خاص مرحلے میں داخل بھی نہیں ہوئی تھی کہ لڑکی کے باپ نے یوسف کی غربت کو دیکھ کر اپنی لڑکی دینے سے انکار کر دیا! - میں نہیں جانتا اس واقعہ نے اس پر کیا اثر کیا۔ بظاہر اُس نے بدنصیبی کے اس تازہ واقعہ کو خاموشی کے ساتھ سنا اور کسی رائے کا اظہار نہ کیا۔ اس کے تین دن بعد میں صبح ہی صبح اُس کے یہاں پہنچا۔ اُس کی آنکھیں شب بیداری سے سُرخ تھیں اور بستر پر ادھر اُدھر کتابیں بکھری پڑی تھیں رسمی گفتگو کے بعد وہ کہنے لگا ایک دو دن سے یہ خیال مجھے بُری طرح پریشان کر رہا ہے کہ میری زندگی محرومی کی ایک ختم نہ ہونے والی کہانی بن کر رہ گئی ہے۔ میں ازلی اور ابدی محروم ہوں۔ بچپن سے لیکر اب تک میری زندگی جتنی محرومیوں سے گذر چکی ہے وہ سب کی سب مجھے یاد آ گئی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے ان محرومیوں سے انتقام لوں۔ ایک نہ ایک دن میں انتقام لے کر چھوڑوں گا۔

تاہم میں نے اُس کی شادی کے لئے رشتے کی تلاش جاری رکھی اور ایک جگہ بات پکّی کر لی۔ اس کامیابی سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں اُسی وقت اُسے اطلاع دینے کے لئے اُس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بازار میں سے گذر رہا تھا کہ یوسف کے ایک ساتھی کلرک نے آواز دے کر مجھے ٹھہرا لیا۔

آپ کے یوسف نے تو کمال کر دیا ہے ——"

"کیا" سوال پوچھتے ہوئے میرا دل مایوسی سے ڈوب رہا تھا۔

"اس نے بینک کا روپیہ چُرا لیا ہے —— گرفتار ہو چکا ہے"

جب میں لوٹا تو بار بار مجھے خیال آ رہا تھا، کیا یوسف اپنی محرومیوں کا انتقام لے چکا ہے؟ -

عزیز اثری

سفر

آج جب تیسری بار ماں کا خط مجھے ملا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رخصت کیلئے درخواست دیدی۔ اور خوش قسمتی سے اگلے ہی دن مجھے رخصت مل گئی۔ جس روز صبح مجھے گاڑی میں سوار ہونا تھا اس رات میں خوشی کے انوکھے جذبے کو لئے چھت پر بستر پر لیٹا چمکتے لرزتے ہوئے ستاروں میں کھویا ہوا تھا۔ جو کسی غم نصیب کے آنسوؤں کی طرح فلک کے رخساروں پر بکھرے ہوئے تھے اور جنہیں پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ ستارے اس طرح بکھرے ہونے کی بجائے ایک مسلسل تار کی صورت میں ہوتے تو اس کے ذریعے انسان کب کا خدا تک پہونچ گیا ہوتا۔ انسان اس طرح تاریکیوں میں نہ بھٹکتا وہ آسمانی بلندیوں کو طے کر کے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔ خدا جسے کائنات اور انسان کا خالق کہا جاتا ہے۔ لیکن میں نے سوچا کہ خدا کائنات کا خالق سہی لیکن انسان کی اصلی خالق تو ماں ہے ماں جو اپنے خون اور گوشت و پوست سے انسان کی تخلیق کر کے اُسے اس طرح وقت کی لہروں کے سپرد کر دیتی ہے جس طرح کوئی فنکار اپنی روح اور ذہن کے سوز سے پیدا کئے ہوئے شاہکار کو پبلشر کے آگے پیچ ڈالتا ہے۔ کبھی کبھی پبلشر فنکار کی تخلیق کو قبول کرنے سے انکار بھی کر کے واپس لوٹا دیتا ہے۔ "ناکام تخلیق"۔

اور جب میں ابدی اور ازلی ناکام وقت کے طوفان کے تھپیڑے کھاتے کھاتے شل اور نڈھال ہو جاتا ہوں تو ماں کے شفقت بھرے ہاتھ کی ضرورت مجھے شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے۔ جب ماحول کی جھلس دینے والی ویرانیاں میرے حساس اور ناتواں دل کو جلا کر راکھ کرنے لگتی ہیں جب میرے احساسات غموں اور تفکرات کے بھاری بوجھ تلے دب کر کراہنے لگتے ہیں۔ میری روح راہِ حیات میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے زخمی ہو جاتی ہے۔ دکھ، درد یاس اور مصائب کی مجھے عطا کردہ ازلی تحائف جب حد سے بڑھ کر میرا گلا گھونٹنے۔ مجھے لینے، ستانے لگتے ہیں۔ میرے غم بھرے دل سے آہوں کا دھواں اُٹھ اُٹھ کر جب میری ہی دنیا کو تاریک تر کر دیتا ہے۔ اور رات کی المناک تنہائیوں میں جب میری بے بسی کے آنسو اُمنڈ امنڈ کر لرزتے کانپتے ہوئے ستاروں کی طرح بکھر جاتے ہیں تو مجھے ان آنسوؤں کے پونچھنے والے کی ضرورت اتنی ہی شدت سے محسوس ہوتی ہے جتنی ان غموں، دکھوں اور یاس کے عالم میں بھی زندہ رہنے کی۔ میں اس وقت اپنے ویران ماحول کے بھڑکتے ہوئے دوزخ سے بھاگ کر محبت بھری آغوش میں آگرتا ہوں اور شفقت بھرا ڈھیلا ڈھالا ہاتھ میرے سر پر پھرنے لگتا ہے "بیٹا! تم کس قدر دُبلے ہو گئے ہو۔ تمہاری حالت پہلے تو ایسی کبھی نہیں ہوئی تھی تمہیں ہو کیا گیا؟" اور ماں کے چمکتے لرزتے ہوئے آنسو ٹپ سے میرے سر پر آگرتے ہیں۔ اور پھر میرے اپنے آنسوؤں سے ملکر دکھ درد اور یاس کے سارے داغوں کو دھو ڈالتے ہیں۔ بے کسی اور تنہائی کے پرانے ناسور دھل کر صاف ہو جاتے ہیں۔ اور ٹھنڈا ٹھنڈا سا مرہم۔ اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے جنت سے پُرسکون وادی میں پہنچ گیا ہوں جیسے لق ودق صحرا سے بھاگ کر نہایت ٹھنڈی جاں بخش سائے میں آرام کر رہا ہوں۔ اور ہولے سے آنکھیں یوں بند کر لیتا ہوں جیسے بیچ بیچ انسانی آبادی اور جھگڑوں سے دُور جنت میں آگیا ہوں۔

مسرت محسوس کرنیکے باوصف یہ رات میں نے کچھ سو کر، کچھ جاگ کر اور کچھ خیالوں کی رو میں بہہ کر گزاری۔ دراصل غموں ... طبیعت کو بیداری کا کچھ ایسا عادی بنا دیا ہے کہ اگر کبھی کبھار کوئی خوشی ہاتھ آبھی جائے تو بھی میں اس حقیقت کو بھول

صبح کو اُٹھتے ہی میں سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا اور شام کو گاڑی میں سوار ہوتے وقت بھی وہی کشمکش اور اذیت ناک بد انتظامی جو زندگی کی ہر دوڑ میں پیش آتی ہے۔ میں ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرنے کا قائل اور عادی ہوں۔ اگر کبھی بھولے سے مجھے انٹر سے بڑھ کر سکینڈ کلاس میں سفر کرنا پڑ جائے تو جان پر بن آتی ہے۔ ان ڈبوں کا ماحول میرے لئے کچھ اس قدر اجنبی اور بیگانہ سا ہوتا ہے کہ میری حسّاس اور شرمیلی طبیعت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس تیسرے درجے کی فضا میری زندگی کی فضا سے عین مطابق بلکہ ہوبہو وہی ہوتی ہے۔ وہی ایک دوسرے کو دھکا دیکر اندر آگے بڑھنے کی کوشش۔ ایک کو پرے دھکیل کر اُس کی جگہ پر قبضہ جما لینے کی سعی وہی یاسیت میں لپٹی ہوئی گھٹی گھٹی بندھی بندھی زندگی، خود سے بیزار اندر ہی اندر گھلتی اور الجھتی ہوئی زندگی، وہی شدت وہی اذیت ناک سرگرمی اور وہی بھری بھری ویرانی جیسے دونوں جہان کی حسرت، یاس اور دکھ نے اس ڈبے کو محیط کر لیا ہو۔

میں بھی جب دھکوں سے بچنے کی کوشش میں دھکے کھاتا ہوا اپنے سامان سمیت ایک طرف آ پڑا تو اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ اتنے ٹھسے ٹھسے بھرپور ڈبے میں کہیں کھڑے ہونے یا اڑنے کی جگہ بھی مل سکیگی؟ اسی کوشش میں میری نگاہیں زبردستی ایک دوسرے کے سہارے کھڑے اور درمیان میں گاڑی کی تال پر وجد میں آتے اور بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے لوگوں پر پڑیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سب مسکرانے لگے ہیں۔ وہ شاید میری اِدھر اُدھر جگہ تلاش کرنے کی نادانی پر یا مجھے بھی اپنی ہی طرح مصیبت میں گرفتار دیکھ کر مسکرانے لگے تھے میں اُنکی نگاہوں سے گھبرا سا گیا۔ ان پریشان، اجنبی اور شام کی دھندلی روشنی میں آسیبی صورت اختیار کرتی ہوئی نگاہوں سے خوف زدہ سا ہوگیا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے اپنا ہاتھ اوپر کو ایک طرف پھیلا دیا۔ جہاں یہ خوش قسمتی سے بالائی برتھ پر رکھے ہوئے کسی ٹرنک سے اٹک گیا۔ مجھے سہارا مل گیا۔ اس ٹرنک کے قریب ہی دو تین کھدر پوش آدھے لیٹے آدھے بیٹھے اپنی پسندیدہ سیاسی جماعت پر بڑے آرام سے گفتگو کر رہے تھے اور مقابل کی بالائی برتھ پر چند نوجوان چہرے آگے کو بڑھائے نفرت بھرے غور سے یوں اُنکی باتیں سن رہے تھے جیسے ابھی الجھ پڑیں گے اور وہ سچ مچ الجھ پڑے۔ گاڑی مسرّت کے لمحات اور وقت کی طرح بڑی تیزی سے بھاگی جا رہی تھی اور اُن لوگوں کی سیاسی بحث کو ہضم کرنے کی کوشش میں پوری قوت سے چیخ چلا رہی تھی۔ باہر رات کی تاریکی آہستہ آہستہ بال بکھرائے بڑھی آ رہی تھی اور اتنے لمبے ڈبے کے اس طرف ایک اکلوتا بلب اس طرح جلنے لگا جیسے محکمہ ریلوے کی کفایت شعاری کا رونا بڑے سلیقے سے رونے لگا ہو۔

گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو بحث کرنے والوں کی غصیلی آوازیں اس طرح فضا میں ناچنے لگیں جیسے مرگھٹ میں بقا و فنا کو ملاتی ہوئی خوفناک آگ۔ انتہائے جوش میں وہ "پنڈت نہرو" "مہاتما گاندھی" ...... "اور قائد اعظم" یوں اچھال رہے تھے جیسے زندگی کی آخری بازی پر مہرے بڑھائے جا رہے ہوں۔ سارا ڈبہ گویا اُن کے جوش سے مرعوب ہوکر قریب قریب خاموش ہوگیا تھا صرف میرے قریب ہی کھڑا ہوا ایک لمبا تڑنگا جاٹ اپنے کسی خیال یا الفاظ کے شعلے برسا دینے بحث کرنے والوں پر بڑے زور اور وثوق سے ہنس رہا تھا۔ گاڑی پھر تاریک فضا کو چیرتی ہوئی بڑھنے لگی تاریکیاں اور زیادہ گہری اور بوجھل ہوکر ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھیں جیسے میرا ویران دم گھٹنے والا ماحول بڑی تیزی سے میرا تعاقب کر رہا ہو۔ گاڑی دوسرے اسٹیشن پر آکر رکی تو دروازے کو زور سے دھکیل کر کھولنے میں ناکام رہنے کی [illegible] کھڑکی سے کود کر دو خوش پوش نوجوان اترتے وہ اپنے [illegible] سنبھلنے لگے [illegible] سیٹ پر بیٹھے ہوئے تین چار آدمی اتر گئے۔ میں بڑی دیر سے ایسے موقع کی تاک میں تھا آگے بڑھ کر بیٹھ گیا [illegible]

ساتھ ہی وہ لمبا تڑنگا سا جاٹ بھی آن ٹپکا۔ سیاسیات پر بحث کرنے والے بے حد سیخ پا ہو رہے تھے قریب تھا کہ وہ باتوں سے اتر کر ہاتھوں پر آجاتے کہ نیچے ہماری سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک مولوی نما شخص اپنی ڈاڑھی سمیت اس آگ میں کود پڑا۔ ان جوشیلے نوجوانوں کو مخاطب کر کے وعظ کے انداز میں کہنے لگا "لیکن آپ لوگوں کو آزاد اور دوسرے علمائے کرام کی شخصیتوں کا احترام کرنا ہی ہوگا"۔ "اونہہ"۔۔۔ وہ نوجوان تیز مضحکہ خیز لہجے میں کہ کر ہنس اور گاڑی پھر چل پڑی اور یہ شور کسی حد تک اس کے گڑگڑاتے شور کے نیچے دبنے لگا۔ نو وارد خوش پوش نوجوان ابھی تک کھڑے کھڑے اس بحث کو سن رہے تھے۔ جب انہوں نے اس جاٹ کو یوں بے سوچے سمجھے ہنستے دیکھا تو آپس میں انگریزی میں کہنے لگے۔ "کس قدر جاہل ہے"۔ "تعلیم اور تہذیب کے بغیر انسان وحشی حیوان سے بدتر ہوتا ہے"۔۔۔ "دیکھو کس طرح منھ کھولے بدتمیزی سے ہنس رہا ہے"۔ پہلے نے پھر کہا۔ ساتھ ہی اُن کے ماتھے پر نفرت کی ایک ناگن سی بل کھا گئی۔ اور اُن کی ایک سیدھے سادھے انسان سے زبردستی کی حقارت مجھے کچھ درست اور اچھی نہ لگی۔ میں نے سوچا تہذیب سے ناواقف۔ آزاد شخص کو بُرا کیوں کہا جا رہا ہے؟ اس قدر نفرت کیوں کی جا رہی ہے؟ صرف اس لئے کہ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے ہنس رہا ہے۔ تعلیم اور تہذیب اچھی سہی لیکن انہوں نے انسانیت کو کیا دیا؟ تکلف تصنع اور دھوکے! اس کی خوشیاں تک چھین لیں۔ گھٹ گھٹ کر ہنسو۔ آہستہ سے قہقہے لگاؤ۔ موقع محل دیکھ کر مسکراؤ۔ اپنی فطرت اپنی مرضی کو ختم کر دو۔ اپنی انفرادیت اپنی روح کو کچل دو دبا ڈالو مٹا دو انکی ضرورت نہیں ہے۔ رٹائے ہوئے طوطے اور سدھائے ہوئے بندر بن جاؤ سماج اور قانون کی حدوں میں رہ کر ان کے اشاروں پر ناچو۔ بالکل بندر کی طرح۔۔۔ یہ ارتقاء انسانی ہے یا انسان سے پھر بندر بن جاؤ اور۔۔۔ اور کہو ڈارون زندہ باد!

مجھے اس وقت گوئٹے کے وہ الفاظ یاد آنے لگے "نظم کے بغیر آزادی اور قانون کے بغیر نجات نہیں مل سکتی"۔ اور میں نے سوچا کہ انسانیت تہذیب اور نظام کے ماتحت آتے ہی غلام ہو کر رہ گئی۔ بے دست و پا۔ اپاہج۔ موجودہ قانون نے اسکی رہی سہی روح کا گلا گھونٹ دیا۔ آزادی۔ آزادی کے بغیر نہیں مل سکتی۔ انسانیت قانون اور تہذیب کے شکنجے میں کس کر ابدی غلام بنا دی گئی ہے۔ انسانی ترقی کے شیدائیوں نے سائنس کی آڑ میں انسانیت کو بم برسا برسا کر فنا کر دیا ہے اب انسانیت کہاں ہے؟ انسانیت اپنی تمام ارتقائی منازل طے کر کے حیوانیت کی سطح پر اتر آئی ہے۔ اب انسان انسان نہیں رہا۔ وہ مہذب، متمدن اور عالم ہو گیا ہے۔ سدھایا ہوا۔ پٹرول، لوہے اور کوئلے سے چلنے والا مشینی ڈھانچہ جس میں سے انسانیت کی روح نکال کر، نچوڑ کر، ریڈیم کے طور پر ایٹم بم میں استعمال کر لی گئی ہے۔ اور اب انسان اپنے دیرینہ مسکن زمین کی ذلیل پست سطح سے بلند۔ بلند تر ہوتا جا رہا ہے وہ اڑ کر حدِ نظر سے بھی آگے چاند ستاروں میں سے ہوتا ہوا خدا تک پہنچ جائیگا۔ اور وہاں سے پھر بم برسائیگا۔ قحط، بیماریوں، فاقوں، بربادیوں اور تفریق کے بم اور خدا؟ خدا اپنی تخلیق کے کمال ارتقاء پر خاموش مسکرائیگا۔ چپ چاپ خوش ہوگا ہنسے گا قہقہے لگائیگا۔۔۔ ہہہہ۔۔۔!

گاڑی خود کو جھٹک کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے کسی ذہن میں خیالات کا طوفان اچانک تھم جائے۔ میرے خیالات کا تانا لرزتے کانپتے ہوئے ستاروں کی طرح بکھر کر رہ گیا۔ خوش پوش نوجوانوں میں سے ایک دُبلا سا نوجوان کسی کام سے باہر چلا گیا۔ اور کچھ مسافر بھی یہاں اتر گئے۔ ڈبے میں دیر سے کھڑے ہوئے مسافروں نے بڑھ کر خالی جگہوں پر قبضہ کر لیا وہ موٹا سا نوجوان بھی سامنے کی سیٹ پر جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اپنے ساتھی کے لئے جگہ نہ رکھ سکا۔ وہ جب لوٹ کر آیا تو اپنے ساتھی کو بیٹھا دیکھ کر یوں ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے اپنے ساتھی کی اس ہی خود غرضی کی

نوعیت اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اُس کے پیچھے ہی ایک بوڑھا سا بھکاری بھی ڈبے میں آگیا اور پرلی طرف سے بھیک مانگنے میں مصروف ہوگیا۔ کمرے میں ابھی تک سیاسی بحث زوروں پر تھی۔ اور مولوی نما آدمی کے منہ سے جھاگ کے چھینٹے اڑ اڑ کر کچھ ڈاڑھی پر جم رہے تھے اور کچھ تبرک کے طور پر پاس بیٹھے ہوئے لوگوں پر۔ جتنا اُس کا غصّہ اور جوش بڑھتا جا رہا تھا مقابل کے نوجوانوں کے چہروں پر جو اب بالائی برتھ سے اُتر کر نیچے آگئے تھے اتنی ہی نفرت پھیلتی اور واضح ہوتی جا رہی تھی اور وہ پوری کوشش سے اپنی گفتگو اور لہجے میں اس نفرت کا مظاہرہ کرنے میں محو تھے۔ بحث شروع کرنے والے مُنّمر کھدر پوش اب قدرے چپ ہوگئے تھے اور اکثر لقمے کے طور پر کچھ نہ کچھ بول دیتے تھے۔

گاڑی چلی تو وہ دبلا سا نوجوان پھر کسی سیٹ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا جاٹ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا —"آیئے بابوجی! یہاں بیٹھ جائیے میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔" اور نوجوان اُسے یوں دیکھنے لگا جیسے اُس کی بات کو ایک مذاق سمجھ رہا ہو۔ جاٹ اُس کی جگہ پر سرک آیا اور نوجوان کچھ حیران سا چپ چاپ اُس کی جگہ پر جاکر یوں بیٹھ گیا جیسے اُسے اُسکا دیرینہ حق مل گیا تھا۔ اُس نے اپنے موٹے سے ساتھی کی طرف دیکھا جو مُسکرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو دیکھ لی اِس کی حماقت؟ کتنا جاہل ہے یہ جاٹ"۔ میں نے ایک ہاتھ سے بالائی برتھ کی زنجیر تھامے ہوئے جاٹ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں اطمینان کی چمک سی لہرا رہی تھی۔ اس کی سیاہ لمبی مونچھیں بے ترتیبی سے ناک کے نیچے بکھری ہوئی تھیں اور ڈاڑھی اس طرح منڈھی ہوئی تھی۔ جیسے کسی نے بڑی بے دردی اور لاپروائی سے کھیت کاٹ ڈالا ہو۔ وہ اب آنکھیں سامنے بلب کی طرف پھیر کر کوئی دیہاتی گیت گنگنانے لگا۔ اور نہ جانے مجھے اُس کی اِس ضرورت سے زیادہ سادگی پر حیرت اور غصّہ سا کیوں آگیا؟ کتنا عجیب اِنسان ہے۔ خواہ مخواہ اپنی جگہ دوسرے کے حوالے کردی۔ نادان! اِسے معلوم نہیں کہ اِسکی ہمدردی اور مروّت کو اخلاق اور تہذیب کے اِس دور میں شرافت نہیں حماقت سمجھا جاتا ہے جہالت۔ اب تو ایک کا گلا گھونٹ کر اُس کے حقوق کو غصب کرلینے کا وقت ہے۔ ایک کو دھکا دیکر اُس کی جگہ پر قبضہ کرلینے کا زمانہ ہے۔ یہ سادگی — یہ نادانی — یہ ہمدردی پرانے وقتوں — قدیم زمانے کی باتیں ہیں۔ اُس وقت کی باتیں جب انسان جاہل ہوتا تھا۔ تعلیم — تہذیب اور سائینس سے۔ لاعلم۔ ہاں یہ اُس قدیم — بہت قدیم زمانہ کی باتیں ہیں جب اِنسان اِنسان نہیں — حیوان تھا۔ جانور اپنے جسم اور ستر کو پتوں سے ڈھانپتا تھا۔ پتھروں کے ہتھیار بناتا تھا اور وحشی تھا۔ جب وہ جنگل کے خونخوار درندوں کو مارنا بڑی بہادری — دانائی اور دلیری سمجھتا تھا۔ وہ دن رات اُن جنگلی حیوانوں کا خون بہایا کرتا تھا۔ (اِنسانوں کا نہیں) کیونکہ آخر حیوان تھا نا! اِنسانیت سے ناواقف۔ موجودہ ترقی یافتہ اِنسان کے مقابلے میں بالکل وحشی اور اپنی اس جہالت اور وحشت پر بڑا خوش بڑا مطمئن ہوا کرتا تھا۔ بڑی لمبی عمر پاکر بھی مرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اپنی اس زندگی کو بڑی خوشگوار خیال کرتا تھا۔ پُرسکون — اِسی جہالت کے باعث وہ وحشی لوگ اپنی اِس خوشی کے عالم میں دیوتاؤں کا ناچ ناچا کرتے تھے۔ اور اُن کی عورتوں پر دیوتا تک فریفتہ ہو جایا کرتے تھے لیکن وہ بھری دنیا میں سوئمبر رچاکر بہادر اور خوبصورت مردوں کو دیوتاؤں پر ترجیح دیتی تھیں دیوتاؤں پر مردوں کو ترجیح! جہالت کا زمانہ جو تھا۔ حیوانیت کا دور! لیکن آج ترقی یافتہ اور متمدن مہذب زمانہ میں بیوفا مردوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ اُنکی بیوفائی اور فطری غرور کو یہ سمجھدار عالم عورتیں خوب سمجھتی ہیں اب بہتر انہیں رونا چاہیے۔ اور یہ وفاداری خوش قسمتی سے کتّوں میں اس قدر زیادہ ہے کہ اب انہیں مجبوراً اُنہی سے پیار و تعلق بڑھانا پڑا ہے۔ یہ انسانیت کے ارتقاء کا دور ہے نا اور وہ زمانہ جہالت کی عورتیں .... میرا ذہن کچھ تو اس خواہ مخواہ کی سوچ اور کچھ نیند سے تھکا ہوا سا اور آنکھیں بوجھل محسوس ہونے لگیں میں اپنے خیالات کو ختم کرکے کچھ دیر

اونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی اونگھ آئی ہی تھی کہ گاڑی رُک گئی۔ اسٹیشن کافی بڑا تھا۔ مجھے اس وقت سگریٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لئے میں اُتر کر سگریٹ لینے چلا گیا جب واپس آ رہا تھا تو میری نظر ساتھ کے سیکنڈ کلاس پڑی جہاں ایک لڑکی بیٹھی ہوئی میری طرف دیکھ رہی تھی اُس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی جو لباس سے اُسکی خادمہ معلوم ہوتی تھی۔ میں ایک لمحہ کے لئے رُک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اس وقت اُس نے اس ادا سے نظریں جھکا لیں کہ میری نگاہ اُس کے دلآویز چہرے پر جم کر رہ گئی۔ گاڑی چل پڑی تو میں لپک کر اپنے ڈبہ میں سوار ہوگیا یہاں اب مسافر کم رہ گئے تھے جن میں سے اکثر سونے کی فکر میں تھے۔ وہ جاٹ بھی اب ایک طرف جاکر بیٹھ چکا تھا اور دونوں موٹے اور دُبلے خوش پوش نوجوان کافی خالی جگہ پاکر لیٹ گئے تھے۔ گرما گرم بحث نقطۂ عروج پر پہنچکر ختم ہوچکی تھی۔ کیونکہ بحث شروع کرنے والے کھدر پوش اُتر گئے تھے۔ اور مولوی نما آدمی اب نیند کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ وہ جوشیلے نوجوان بھی دوبارہ بالائی برتھوں پر چڑھ کر دراز ہوچکے تھے لیکن ابھی انہیں نیند نہیں آ رہی تھی کیونکہ وہ بڑے اطمینان سے ہنس ہنس کر اُن کھدر پوش حضرات کی شان میں بڑی مسکت اور لاجواب گالیاں اُگل رہے تھے چند منٹوں کے بعد وہ کچھ چپ سے ہوگئے جیسے سوچ رہے ہوں کہ اس مولوی نما شخص کو کس طرح پھر بحث میں گھسیٹ کر ذلیل کیا جائے۔ لیکن وہ اُنکی دستبرد اور خطرناک ارادے سے محفوظ اور بے نیاز نیند کی آغوش میں پناہ لے رہا تھا

بوڑھا بھکاری بھی تمام ڈبے کی سخاوت سمیٹ کر اب ہمارے قریب آگیا۔ اُس موٹے سے نوجوان نے لیٹے ہی لیٹے بڑے طمطراق سے ایک اکنی نکالکر اس انداز سے اُس کی طرف بڑھائی جیسے سب کو دکھاکر کہہ رہا ہو۔" دیکھو! میں بھی اتنی دولت کا مالک ہوں کہ بڑی دریا دلی سے پوری ایک اکنی بھیک میں دیسکتا ہوں" اور بھکاری ہماری سیٹ پر اُس دُبلے سے نوجوان کے پاؤں کی طرف خالی جگہ پاکر بیٹھ گیا اور تمام مانگی ہوئی نقدی کو تھیلے سے جیب میں سے ہاتھ پر انڈیل کر گننے لگا کچھ دیر بعد وہ بھی اونگھنے لگا۔

گاڑی تاریکیوں کو چیرتی ہوئی بڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ مجھے نیند محسوس ہونیکے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ سفر میں مجھے کبھی نیند نہیں آتی۔ اور اگر مشکل سے آبھی جائے تو بڑی بے مزہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر میں نے سوچا کہ اب تین گھنٹے تو باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے میں سگریٹ کے ٹکڑے سے نیا سگریٹ سلگا کر دیوار سے پیٹھ ٹیکے بیٹھا رہا اور میرا خیال سیکنڈ کلاس میں بیٹھی ہوئی اس لڑکی کی طرف دوڑ گیا۔ کس قدر حسین ہے وہ! اس کا نظریں جھکا لینے کا انداز کتنا پیارا اور معصوم تھا۔ پھر وہ میری طرف دیکھ بھی رہی تھی...... معاً میرے پاس بیٹھا ہوا وہ دُبلا نوجوان اُٹھ بیٹھا اور بوڑھے بھکاری پر برسنے لگا۔ "تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ یہاں سے اُٹھ کر چلے جاؤ۔ تین چار بار تم اونگھتے اونگھتے میرے اوپر آگرے ہو۔ اٹھو یہاں سے!" اُس کے لہجے کی درشتی اور رُعب سے مرعوب ہونے کی بجائے بھکاری ڈٹ گیا۔ "نہیں اٹھتا۔ تم ساری سیٹ پر قبضہ جمائے لیٹے پڑے ہو اور مجھے ذرا سی جگہ پر بیٹھنے بھی نہیں دیتے" اس شور سے وہ جاٹ۔ مولوی نما آدمی۔ اور دو تین اور مسافر جاگ پڑے۔ وہ نوجوان اور بھی غصے سے کڑکنے لگا "ابھی تو ہم سے بھیک مانگ رہا تھا اور اب آنکھیں دکھاتا ہے بڈھے کھوسٹ!" "دیکھو اس طرح سے بات مت کرو" — بوڑھے کی طبیعت میں شاید جوانی کی تندی ہوئی جولانیاں اور بچپن کی کھوئی ہوئی ضدیں پھر لوٹ آئی تھیں — "میں بھیک مانگتا ہوں تو کیا ... [illegible] ... گاڑی میں ... کی طرح کا مسافر ہوں سب مجھے بھی یہاں بیٹھنے کا حق حاصل ہے" — آخر لوگوں نے سمجھا بجھا کر اُسے وہاں سے اُٹھا دیا اور وہ بڑبڑاتا ہوا دوسری طرف جاکر دروازہ کے قریب نیچے بیٹھ گیا اور دیر تک اُسکے ہونٹ غصے

جاگتے ہوئے لوگ پھر اپنی اپنی جگہوں پر لیٹ کر خود کو نیند کے رحم و کرم پر چھوڑنے لگے اور میں سوچنے لگا کہ بھکاری نے سچ ہی کہا ہے وہ بھکاری بھی لیکن ہے تو مسافر۔ یہ زندگی بھی تو ایک سفر ہے۔ طویل سفر جسے ہر شخص اُمید کی گاڑی کے ذریعے طے کر رہا ہے۔ اُمید کی یہ گاڑی جو رُکتی نہیں چلتی رہتی ہے چلتی رہتی ہے۔ وقت کے آہنی گول گول پہیوں کے سہارے۔ دُکھ درد اور یاس کے حادثوں سے یہ ٹھہر تو جاتی ہے لیکن رُکتی نہیں۔ اِن حادثوں کے باوجود یہ چلتی رہتی ہے۔ ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ کسی کا سفر جلد ختم ہو جاتا ہے۔ کسی کا دیر سے۔ کوئی سو کر، کوئی لیٹ کر یا بیٹھ کر یہ سفر طے کرتا ہے۔ اور کسی کو کھڑے ہو کر بھی سفر کرنے نہیں دیا جاتا۔ لیکن اُسکا سفر ختم نہیں ہو جاتا۔ کوئی سو کر، کوئی جاگ کر کوئی اپنے پریشان خیالات میں غرق رہکر ہی یہ سفر کاٹ دیتا ہے۔ اور کبھی اس خشک ویران تاریکیوں سے گھرے ہوئے سفر میں ایک دلچسپی بھی اُبھر آتی ہے جس سے سفر کی کوفت کم ہو جاتی ہے۔ ایک دلچسپی ایک امید یوں اُبھر آتی ہے جیسے تاریکیوں کے جھرمٹ میں کوئی چمکتی ہوئی شعاع پیدا ہو جائے۔ جیسے ڈوبتے ہوئے کو ایک سہارا مل جائے۔ اور میں نے سوچا میرے اِس سفر میں بھی ایک امید۔ روشنی کی ایک شعاع مل گئی ہے۔ اور پھر میرے خیال نے سکینڈ کلاس میں بیٹھی ہوئی لڑکی میرے سامنے لا کھڑی کی۔ اس کی معصوم اور پیاری صورت۔ اُس کا حسین سراپا۔ اور میں خیال ہی میں اس سے قریب۔ قریب تر ہوتا چلا گیا۔ اُس کے سانس کی گرمی اور تعطّر ذہن کے پردوں پر خوشبو سی پھیل گئی۔ رومان اور پیار کی خوشبو۔ "کونسا اسٹیشن گزر رہا ہے صاحب"؟ میرے قریب لیٹا ہوا دُبلا نوجوان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میں نے خیال نہیں کیا" —— میں پیچھا چھڑا کر پھر اپنے طلسم میں کھو گیا۔ ایک اور اسٹیشن آگیا۔

میں جلدی سے اتر کر سکینڈ کلاس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ اب درمیانی برتھ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آبیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ دلنوازی اور خوابیدہ سی چمک جو بجلی کی روشنی میں بہت واضح تھی، میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں ایک عجیب سے عالم میں کھو گیا۔ وہ دُبلا سا نوجوان سیٹی بجاتا ہوا میرے آگے سے گزر گیا۔ میں نے اُس کی طرف نظریں گھما کر دیکھا وہ بجلی کے کھمبے کے پاس یوں بے فکری سے کھڑا سیٹی بجا رہا تھا جیسے مجھے چھیڑ رہا ہو۔ طنز سے چڑا رہا ہو۔ مجھے غصّہ ہی تو آگیا ——"پاجی۔ بدتمیز"! لیکن میں گھبرا سا گیا اور گاڑی چل پڑی۔ میں اپنے ڈبے میں آبیٹھا تو وہ اپنے ساتھی کو جھنجھوڑنے لگا۔ "اٹھو بھئی اب لوگ جاگ رہے ہیں اور تم سو رہے ہو۔" لیکن موٹا نوجوان کچھ بڑبڑا کر اور پہلو بدل کر ڈھیر کا ڈھیر سویا رہا۔ میں پھر اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ خیالوں سے چونک کر میں بڑی شدت سے چاہنے لگا کہ یہ اگلا اسٹیشن جلد ہی آ جائے اور میں اُتر کر...... لیکن نہ جانے کمبخت گاڑی کی رفتار کیوں سُست ہوتی معلوم ہوتی تھی یا پھر اگلے اسٹیشن کا فاصلہ کئی سو میل بڑھ گیا تھا۔ مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ اسٹیشن کیوں نہیں آتا؟ کیوں نہیں آتا؟ ——
آخر اسٹیشن آیا تو میں پھر وہاں جا کھڑا ہوا اور اُسے اِس انداز سے دیکھنے لگا جیسے وہ میری عرصے کی شناسا تھی۔ میری نظروں میں نہ جانے کسقدر پیار اور پیاس تھی جس نے اُس کے پتلے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ مسکراہٹ! وہ مسکرا رہی تھی۔ ساری کائنات مسکرا اٹھی۔ وہ مسکرا رہی تھی میری روح تک قہقہے لگانے لگی۔ وہ مسکرا رہی تھی —— مسکراہٹ جس میں اجنبیت۔ بیگانگی کو دور کرنیکا عزم تھا۔ مسکراہٹ جس میں یگانگت تھی۔ دستِ شوق و محبت دراز کرنے کی جان بخش دعوت تھی۔ جس میں راز تھا۔ ایسا راز جو مجھ پر بالکل عیاں اور افشا تھا۔ مسکراہٹ جس میں محبت تھی دلآویزی اور سحر تھا۔ مسکراہٹ جس میں دو دھڑکتے دلوں کے افسانے، قصے نغمے تھے۔ اور ہم آہنگی تھی مسکراہٹ جو میری تھی۔ میرے لئے تھی اور میرا دل تیزی۔ بڑی تیزی سے یوں دھڑکنے لگا گویا میرا اس پر کوئی اختیار ہی نہ تھا اور اُس کی نظریں جیسے مجھ میں دھنسی ہوں

جو مجھے بڑی دیر سے کھینچ رہی تھی۔ جذبۂ شوق کی فراوانی نے میرے قدم آگے بڑھا لئے دل کی دھڑکنوں میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی۔ میں نے آدھ ثانیہ کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دُبلا نوجوان پاس ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میری جرأت گویا لڑکھڑا سی گئی۔ اٹھے ہوئے قدم ڈگمگانے لگے۔ اور دل کی دھڑکنوں میں لغزش سی آگئی۔ میں اس کی طرف بڑھنے کی بجائے اپنے ڈبے میں آگیا۔ اور اردگرد کا ماحول۔ فضا۔ سب کچھ میرے زور زور سے دھڑکتے ہوئے دل کے شور میں کھو گیا۔ دھک۔ دھک۔ دھک

گاڑی کافی دیر یہاں رُکی رہی لیکن میں ...... اور گاڑی چیخکر چل پڑی۔ دُبلا نوجوان ڈبے میں نہ آیا "چلو چھٹی ہوئی کمبخت کہیں اور جا بیٹھا ہوگا"۔ میں نے شکر کیا اور پھر تصورات میں جذب ہوگیا۔ خیالوں کا ایک تار بن رہا تھا، ایک جال۔ خول جس میں صرف میں تھا اور وہ تھی۔ باقی ساری دنیا سے علیحدہ الگ اور محفوظ جہاں میں تھا اور وہ تھی۔ اس کی حسین صورت۔ اُس کی سحر خیز آنکھیں تھیں۔ اُس کے پتلے پتلے نازک ہونٹ تھے جن پر معصوم مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔ اُسکا دلآویز لطیف جسم تھا۔ اُس کے گداز بازو تھے۔ اور میں تھا۔ اُس کی زلفوں کا گھنیرا ٹھنڈا سایہ تھا جس نے مجھے میرے جلتے ہوئے ویران ماحول سے چھپا کر پناہ دے رکھی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں پھر انتہائی تیز ہوگئیں اور وہ اور بھی شدت سے میرے دل و ذہن میں بس رہی تھی۔ جذب ہوئی جا رہی تھی۔ رچ رہی تھی۔

سونے والوں کے ایک دوسرے سے مختلف اونچے نیچے خراٹے تیر رہے تھے۔ اور باہر فضاؤں میں تاریکیاں تھیں لیکن میرے خیالوں میں۔ میری دنیا میں وہ دلنواز مسکراہٹ چمک رہی تھی جس نے ویران اور بھیانک تاریکیوں میں چکاچوند پیدا کردی تھی۔ میرا دم گھونٹنے والا ماحول میرا تعاقب چھوڑ چکا تھا اور غم انگیز یاس میں لپٹا ہوا احساس مسرت اور شادمانی۔ روحانی خوشی کے احساس میں تبدیل ہوچکا تھا۔ خوشی۔ سرور۔ ایک نشہ سا طاری ہو رہا تھا۔ رومان اور محبت کا شوق بھرا انوکھا، ان جان، اچھوتا اور دھڑکتا ہوا جذبہ اُبھر رہا تھا۔

گاڑی ٹھہرنے پر پھر جھینپ اور نہ معلوم خوف کے کسی جذبے کے انوکھے سے احساس نے پاؤں پکڑ لئے۔ اور دل کی دھڑکنیں جیسے زور زور سے گھونسے مار مار کر کہہ رہی ہوں۔ "چلو۔ چلو، چلو"۔ "میں .... اُس کے .... پاس .. جاؤنگا جذبات کی شدت نے شوق کو ہکلا سا دیا۔ ایک دو منٹ ٹھہر کر گاڑی چل پڑی۔ ایک مختصر سا تاریک اسٹیشن گزر گیا لیکن مجھے میرا دل ملامت کرنے لگا۔ "وہ کیا خیال کرتی ہوگی؟"۔ اِس خیال نے مجھے ندامت سے تلملا دیا۔ مجھے اپنی اِس حد سے زیادہ شرمیلی اور ڈرپوک فطرت پر غصّہ آنے لگا۔ "تم جو اتنے نفسیات سمجھنے کے دعویدار بنے پھرتے ہو اپنی اِس بزدلی اور بے جا جھینپ کو دور نہیں کرسکتے؟" کسی شے کے خوف یا جھینپ کو دور کرنے کے لئے اُس میں زیادہ سے زیادہ داخل ہونا چاہیئے۔ میں نے سہارا لیکر سوچا اور پکّا ارادہ کرلیا کہ اگلے اسٹیشن پر بہر صورت اُتر کر اُس کے پاس جاؤنگا۔ اُس سے باتیں کرونگا اور .... اور ایسی ہی ذہنی کشمکش میں اگلا اسٹیشن آگیا۔ ایک چھوٹا سا اسٹیشن لیکن میں ایک موہوم سا خوف لیے ہوئے گاڑی سے اُتر گیا۔ اس نے شاید مایوس ہوکر کھڑکیاں چڑھا لیں تھیں۔ صرف دروازہ کی کھڑکی سے جہاں شیشہ چڑھا ہوا تھا روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے جسم کو لیے پائیدان پر چڑھ گیا اور اندر وہی دُبلا نوجوان اُس کے مرمریں ہاتھ کو تھامے سگرٹ کا دھواں اگل رہا تھا۔ دھواں —— دھواں —— دھواں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سارے ماحول۔ ساری کائنات۔ سارے دل و ذہن اور روح پر دھواں پھیل گیا، چھا گیا ہے۔ میری دنیا تاریک، ویران اور سنسان ہوگئی ہے، جس میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۵۱ پر)

ابراہیم بی اے

طوفان

:- کردار :-

مسٹر زیڈ	ــــــــ	پولیس کا افسر۔
مسٹر ایکس	ــــــــ	محکمۂ جاسوسی کا افسر۔
مسٹر سی	ــــــــ	ایک باغی۔
مسٹر آر	ــــــــ	دوسرا باغی۔
بڑھیا	ــــــــ	آزادی کی خواہشمند ایک جوشیلی عورت
نوجوان	ــــــــ	بڑھیا کا لڑکا۔
مالک ہوٹل	ــــــــ	ایک سرمایہ دار

منظر:- ایک ہوٹل کا کمرہ۔ کمرہ ہوٹل کے بالائی حصہ کا ہے چونکہ اس قصبہ میں یہی ایک ہوٹل ہے اور حکومت کے اراکین اکثر اس ہوٹل میں قیام کرتے ہیں، اس واسطے بہترین فرنیچر سے آراستہ ہے۔ تمام کمرے میں دری کا فرش ہے، شرقی جانب ایک دروازہ ہے، جس پر ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دروازے کے سامنے ایک برآمدہ نظر آرہا ہے جس پر ایک آرام کرسی پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جنوبی دروازے سے لگی ہوئی ایک مسہری بچھی ہے جس پر صاف و شفاف بستر ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز ہے۔ اس پر ایک ٹیبل لیمپ رکھا ہے، جس پر سبز شیشے کا شیڈ ہے۔ میز پر دو چار اخبار بھی پڑے ہیں۔ کمرے کے مغربی جانب ایک کھڑکی ہے جس پر دروازے کی طرح ریشمی پردے ہیں اس وقت پردے ہٹے ہوئے ہیں۔ کھڑکی میں کھڑے ہو جانے سے ایک سڑک دکھائی دیتی ہے۔ اس پر ہمیشہ ٹرافک رہتا ہے، جس کے باعث کمرے میں شور و غل کی آواز آتی رہتی ہے۔

کھڑکی میں سے کچھ فاصلے پر پہاڑ نظر آتے ہیں، اور ان پہاڑوں پر بہتی ہوئی ایک تیز رو ندی دکھائی دیتی ہے جس کے بہنے کی آوازیں اکثر خاموشی میں اس کمرے میں سنائی دیتی ہیں۔ موسم اس وقت طوفانی ہے۔ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تیز ہوا چل رہی ہے، اور بجلی کبھی کبھی ایک کڑاکے کے ساتھ چمک جاتی ہے۔ مسٹر زیڈ کھڑکی میں کھڑا، ہوا کی تیزی، بادلوں کی گرج ہوا کے طوفان اور بجلی کی چمک سے قطع نظر اس وقت اپنی نگاہیں ٹرافک پر جمائے ہوئے ہے، لوگوں کے ہجوم۔ گاڑیوں اور موٹروں کی بھاگ دوڑ، پولیس اور فوج کی غیر معمولی مصروفیات اسوقت کسی غیر معمولی حادثہ کی جانب اشارہ کر رہی ہیں

ـــ مسٹر زیڈ ایک دراز قد انسان ہے، مونچھیں بڑی بڑی ہیں اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی، سیاہی مائل سوٹ پہنے ہے۔ وہ خاموشی سے کھڑا سڑک پر نظریں جمائے رہتا ہے، چند منٹ کے بعد مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے مسٹر ایکس پستہ قد ہے، جسم بھرا ہوا ہے اور باتیں کرتے وقت آنکھوں کو مستقل طور پر مٹکاتا رہتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انتہائی خطرناک اور چالاک انسان ہے کمرے میں داخل ہو کر مسٹر زیڈ کو فوجی سلام کرتا ہے اور پھر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ مسٹر ایکس کو دیکھ کر۔

مسٹر زیڈ: قاتل کا کوئی پتہ چلا؟

مسٹر ایکس: حضور والا! — ابھی تک نہیں۔

مسٹر زیڈ: (غصہ سے) ابھی تک نہیں — یہ ہماری کمزوری اور حکومت کی توہین ہے (سوچتے ہوئے) اور پھر قاتل کی سراغرسانی پر تو دو ہزار روپیہ انعام بھی مقرر ہے۔

مسٹر ایکس: حضور والا! ضرور مقرر ہے، لیکن یہاں بغاوت کے آثار ہیں۔ اب حکومت کو اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ سختی سے کام چلتا نظر نہیں آتا۔

مسٹر زیڈ: بغاوت؟ اس حکومت کے خلاف بغاوت جو ان کی عزت، ناموس، امن وسکون اور دولت کی حفاظت کرتی ہے — (غصے سے) یہ بغاوت نہیں سرکشی ہے۔

مسٹر ایکس: حضور والا! سرکشی اور بغاوت ہم معنی ہیں۔ حفاظت ہی مقصود ہے تو پیار اور ظلم کا اتحاد ہونا چاہئے — ایک طرفہ وزن پلڑے کو زمین سے اٹھنے نہیں دیتا۔

مسٹر زیڈ: (مسٹر ایکس کو غور سے دیکھ کر) تم حکومت کی مشینری کے ایک پرزے ہو، تمہارے اوپر حکومت کی بنیادیں ہیں اگر تم ڈگمگائے تو دیواریں گر پڑیں گی۔ تمہیں مستقل مزاج ہونا چاہئے۔

مسٹر ایکس: میرے قدم کبھی نہیں ڈگمگاتے — لیکن اب میں روزانہ کی اطلاعات سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکومت کو اپنا رویہ تبدیل کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ قصر استبداد منہدم ہوتا نظر آتا ہے۔

مسٹر زیڈ: (غصے سے) میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تمہارے خیالات پر بھی وہی فضا اثر انداز ہے، جو میں نے اس گندے قصبے میں آکر محسوس کی ہے۔

(مسٹر ایکس فوجی سلام کرکے کمرے سے نکل جاتا ہے مسٹر زیڈ کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے، چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی پریشانی میں مبتلا ہے کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے، کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ بڑبڑاتا ہے)۔

مسٹر زیڈ: محکمہ جاسوسی ناکام ہو چکا ہے! — وہ محکمہ جس کے ملازم ہوتے ہوئے آج تک عوامی تحریکوں کو کچلا گیا ہے، سرکش جماعتوں کے پرخچے اڑائے گئے ہیں۔

(پھر خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد مالک ہوٹل داخل ہوتا ہے۔ بہت موٹا تازہ اور بے ڈول انسان ہے۔ مسٹر زید کو سلام کرکے)

مالک ہوٹل: حضور والا! کیا آج شام کھانے کا انتظام ہوٹل میں ہوگا — یا — (مسٹر زید کا چہرہ طنز آمیز نگاہوں سے دیکھ کر) آج بھی آپ کہیں مدعو ہیں۔

(مسٹر زیڈ مالک ہوٹل کو سر سے پیر تک دیکھتا ہے جیسے اس نے اس طنز کو محسوس کر لیا ہے)

مسٹر زیڈ: میں آج کھانا ہوٹل ہی میں کھاؤں گا — مگر دیکھو — میں اس قدر چارج ادا کرنے کو تیار نہیں۔

مالک ہوٹل: لیکن حضور —

مسٹر زید: (قطع کلام کرکے) تم لوگ تو چاہتے ہو کہ ہم کو جس قدر الاؤنس حکومت کی جانب سے ملتا ہے وہ سب تمہاری نذر کر جائیں۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کھانا اور اُڑانا جانتے ہیں۔ میں ہر روپیہ میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا چاہتا ہوں۔ سمجھے۔

مالک ہوٹل: سمجھ گیا سرکار۔

مسٹر زید: ہاں دو روپیہ سے زیادہ نہ ہو — میں کھانے کا بل اس سے زیادہ ادا کرنے کو تیار نہیں — مجھے صرف پچیس روپے یومیہ ہی تو الاؤنس ملتا ہے۔

(پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ مالک ہوٹل سلام کرکے دروازے کی جانب جاتا ہے۔ مسٹر زید مالک ہوٹل سے مخاطب)

مسٹر زیڈ: اور ہاں بھئی — ایک بات تو اور سنو۔

مالک ہوٹل: (رک کر) فرمائیے۔

مسٹر زیڈ: (مالک ہوٹل کے پاس آکر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) تمہارے اس ہوٹل میں تو ہر قسم ہی کے لوگ آتے ہونگے!۔

مالک ہوٹل: جی ہاں۔

مسٹر زیڈ: کیا تم ان میں سے کسی پر شک کر سکتے ہو جس نے

تصبہ کے مجسٹریٹ کا قتل کیا ہے۔

مالک ہوٹل: حضور والا! بہت مشکل ہے۔ لوگ اس قسم کی گفتگو ہوٹل اور سرعام کرتے ہوئے گریز کرتے ہیں۔

مسٹر زیڈ: تم ہماری کچھ رہنمائی کرو۔ (دو انگلیاں اُٹھا کر دو پر زور دیتے ہوئے) - دو ہزار انعام مقرر ہے۔

مالک ہوٹل: دو ہزار! ـــ (کچھ اس انداز سے کہتا ہے، جیسے کسی نے دو ہزار روپیہ اُس کے ہاتھ میں رکھدیا ہے) لیکن سرکار معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کسی جماعت کا ہے فرد کا نہیں۔

مسٹر زیڈ: (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں - ہمارے محکمہ جاسوسی کو بھی یہی اطلاع ملی ہے کہ یہاں کوئی دہشت پسند جماعت موجود ہے، اس میں لوگ شامل ہیں اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے۔

مالک ہوٹل: اور ایسے لوگ عام شہریوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا شناخت کرنا سخت دشوار ہے۔

(کمرے میں کچھ دیر کامل خاموشی رہتی ہے۔ مسٹر زیڈ کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے، مالک ہوٹل خاموش کھڑا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا ہے۔ مسٹر زیڈ مالک ہوٹل سے مخاطب ہوکر)

مسٹر زیڈ: تم جانتے ہو جب کسی ملک میں شورش اور بغاوت پھیلتی ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ - (مالک ہوٹل مستفسرانہ انداز میں مسٹر زیڈ کا چہرہ دیکھتا ہے، مسٹر زیڈ مالک ہوٹل کا چہرہ اس انداز سے گھورتے ہوئے جیسے اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو) ـــ تباہی و بربادی قتل و غارت - پولیس اور فوج کی گولیاں ـــ لوٹ مار تمھارے اس ہوٹل اور دیگر خوبصورت عمارتوں میں آگ و طوفان ـــ تاریخ بغاوت ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے ـــ لیکن اگر ایسی شورشوں کو قبل از وقت ہی دبا دیا جائے تو ـــ

مالک ہوٹل: (قطع کلام کرکے) اس کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں؟

مسٹر زیڈ: ہاں ـــ ملک ان تمام لعنتوں سے پاک ہوجاتا ہے۔

مالک ہوٹل: (سوچتے ہوئے) ملک میں تباہی و بربادی پھیلے گی۔ (کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر) یہ خوبصورت کمرہ، یہ قیمتی فرنیچر، سب تباہی کی نذر ہوجائیگا - میں برباد کردیا جاؤں گا (کھڑکی میں سے پہاڑوں کو دیکھنے لگتا ہے - پہاڑوں پر بہتی ہوئی ندی اپنے ساتھ بڑے بڑے درختوں کو بہاکر لاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے - پھر جیسے خود ہی سے باتیں کر رہا ہو) یہ ندی آجکل کس قدر خونخوار ہوگئی ہے - کیسے بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھاڑ کر رکھدیئے ہیں۔

مسٹر زیڈ: (مالک ہوٹل کے چہرے پر پریشانی محسوس کرتے ہوئے) اس ندی میں طوفان آرہا ہے نا ـــ اگر اس قصبہ میں بغاوت پھیلی تو پھر اس کمرے اور ہوٹل ہی کی کیا حقیقت ہے۔ سرکاری عمارتیں۔ خوبصورت ٹاؤن ہال - قیمتی لائبریریاں - درسگاہیں سب تباہ ہوجائیں گی ـــ بچے یتیم، خوبصورت جوان عورتیں بیوہ - تمھارے بینک لوٹ لئے جائیں گے ـــ تمھارا سرمایہ برباد ہوجائیگا۔ تم مفلس ہوجاؤگے۔

مالک ہوٹل: (بیتاب ہوکر التجا آمیز لہجہ میں) تو مجھے اس تباہی سے بچایئے۔

مسٹر زیڈ: گھبراؤ نہیں۔ اس کی کوشش کی جارہی ہے تم بھی کوشش کرو کہ قاتل کا سراغ لگ جائے ـــ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔

مالک ہوٹل: میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں ـــ لیکن قاتل کون ہے، اس کا مجھے علم نہیں۔

مسٹر زیڈ: (کچھ سوچ کر) حکومت نے دو ہزار روپیہ مقرر کیا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) میری تحقیقات سے قاتل کا سراغ ضرور ملیگا۔ (سگریٹ جلا کر پینے لگتا ہے، دو تین کش لیکر مالک ہوٹل کے پاس جاتا ہے اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھکر رازدارانہ لہجے میں) ایک سودا کرتے ہو۔

مالک ہوٹل: (تعجب سے) سودا!؟

مسٹر زیڈ: ہاں سودا ـــ (رازدارانہ لہجے میں) اگر قاتل کا سراغ مل گیا تو میں تمھیں مطلع کردوں گا ـــ

اور تم حکومت کو۔ تمہیں دو ہزار روپیہ ملجائیگا۔ بس ایک ہزار تمہارا ایک ہزار میرا۔ (مالک ہوٹل کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ اس کا چہرہ گھورتا ہے مسٹر زیڈ کے چہرہ پر امید و بیم کے ملے جلے اثرات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ چند سیکنڈ وہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر اس انداز سے جیسے وہ مالک ہوٹل کے سوچ بچار سے گھبرا گیا ہو) جواب دو دوست یہ ایک ایسا کوئی بڑا مسئلہ تو نہیں۔ (پھر ہاتھ سکڑا کر مالک ہوٹل کیطرف بڑھاتے ہوئے) لو ہاتھ ملاؤ۔ اور کہو — مجھے منظور ہے۔

مالک ہوٹل:۔ (آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھاکر ملاتے ہوئے) مجھے منظور ہے مگر —

مسٹر زیڈ:۔ (قطع کلام کرکے)۔ اب اگر مگر کچھ نہیں۔ بس جاؤ اور خاموشی سے اپنا کام کرو۔ (مالک ہوٹل دروازہ کی جانب بڑھتا ہے) لیکن دیکھو — (مالک ہوٹل رک کر مسٹر زیڈ کا چہرہ دیکھتا ہے) کسی کو یہ راز معلوم نہ ہو ورنہ باغی شہر میں ادھم مچادیں گے اور پھر تباہی و بربادی۔

مالک ہوٹل کچھ سوچتا ہوا کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے اور مسٹر زیڈ کو فوجی سلام کرکے)

مسٹر ایکس:۔ حضور والا۔ کچھ مشکوک لوگ گرفتار کئے گئے ہیں۔ اگر حکم ہو تو آپ کے سامنے حاضر کروں۔

مسٹر زیڈ:۔ ضرور — ابھی لاؤ۔ سگریٹ پھینکدیتا ہے اور دوسری سگریٹ جلا کر ایک صوفے پر بیٹھ جاتا ہے مسٹر ایکس کمرہ سے نکل جاتا ہے: اور چند منٹ بعد "مسٹر سی" کو لیکر داخل ہوتا ہے۔ اور خود مسٹر زیڈ کے آنکھ کے اشارہ پر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ کچھ دیر تک مسٹر سی کو سر سے پیر تک دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کچھ طنز آمیز لہجہ میں) — ہوں۔ تو آپ ہیں باغیوں کے سرغنہ ہیں —

مسٹر سی:۔ (تعجب سے)۔ سرغنہ! گویا باغیوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں: (زور دار قہقہہ لگاکر۔ ہمارے یہاں تو کوئی ایسی تفریق نہیں۔ (مسکراتے ہوئے) ہمارے یہاں سب لیڈر ہیں اور سب سپاہی ہم سب اپنے حقوق کے تحفظ کے واسطے ظلم و استبداد کے خلاف دوش بدوش کھڑے ہیں۔ (طنزیہ لہجہ میں) یہ چھوٹے بڑے اور امیر و غریب کی تفریق آپ ہی کو مبارک ہو

مسٹر زیڈ:۔ لیکن حکومت کے خلاف بغاوت کا انجام جانتے ہو؟

مسٹر سی:۔ اگر حقوق کا تحفظ اور ظلم کے خلاف احتجاج بغاوت ہے تو میں خوش ہوں کہ میری زندگی کا مقصد حاصل ہو رہا ہے۔ اس بغاوت پر زندگی کے تمام عیش قربان۔

(فاتحانہ مسکراہٹ سے مسٹر زیڈ کو دیکھتا ہے

مسٹر زیڈ:۔ لیکن بغاوت کا انجام تباہی و بربادی اور خون کی ہولی ہے۔ فنون و ادب کو تباہ کرنا ہی بزرگوں کی یادگاروں کو خون سے رنگنا ہے۔

مسٹر سی:۔ (مسکراکر) یہ ایک خوشگوار انتقام ہے۔ (طنزیہ لہجہ میں) بزرگوں کی وہ عمارتیں جنمیں کبھی آزادی کے گیت گائے جاتے تھے اب اپنی غلامی پر ماتم کرتی ہیں (جوش میں ذرا بلند آواز سے) اب اُن کے در و دیوار کو ہمارے خون کے نقش و نگار کی ضرورت ہے۔ طوفان کے دھارے میں بہکر ہمیں وہ حاصل کرنا ہے جس کے لئے ہماری روحیں بے چین ہیں جس میں اب اِن عمارتوں کی ضرورت نہیں جن پر انصاف کے نام کے پرچم اڑتے ہیں لیکن جو ہر شام انصاف کے نام پر ماتم کرکے شب کی سیاہیوں میں اپنی گردنیں جھکا لیتے ہیں۔ ہمیں وہ ادب اور آرٹ نہیں چاہیئے جو روح کو بیدار نہیں کرتا بلکہ اُسے لوری دیکر سُلاتا ہے۔

مسٹر زیڈ:۔ لیکن بغاوت کا انجام موت ہے۔
مسٹر سی:۔ (مسکرا کر)۔ اور موت۔ آزاد زندگی کی پہلی سیڑھی ہے۔
مسٹر زیڈ:۔ تو پھر قاتل کا پتہ نہیں دے سکتے ہیں۔
مسٹر سی:۔ (جوشیلے لہجہ میں) عوام باغی ہیں اُن کی روحیں باغی ہیں۔ اُن کے جذبات باغی ہیں۔ کچل دیجئے ان جذبات کو مٹا دیجئے اُن روحوں کو آپ کا مجرم خود بخود فنا ہو جائیگا۔ ایک شانِ استغنیٰ سے دروازہ کی جانب دیکھتا ہے۔ مسٹر زیڈ تالی بجاتا ہے۔ مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے۔
مسٹر زیڈ:۔ دوسرے شخص کو لاؤ۔
(مسٹر ایکس مسٹر سی کو اپنے ساتھ لیکر کمرہ سے نکلجاتا ہے کچھ دیر بعد ایک دوسرے شخص مسٹر آر کو لیکر داخل ہوتا ہے۔ مسٹر آر کی عمر پچاس سال سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ معمولی لباس پہنے ہے۔ مسٹر آر کو کمرہ میں چھوڑ کر مسٹر ایکس کمرہ سے نکلجاتا ہے مسٹر زیڈ مسٹر آر کو دیکھکر ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے)
مسٹر زیڈ:۔ تشریف رکھیئے
مسٹر آر:۔ (طنزیہ مسکرا کر)۔ تشریف؟ حضور والا! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں! آپ حاکم ہیں اور میں باغی۔ میں آپ کے مقابلہ میں کھڑا ہی رہونگا بیٹھنا ٹھہراؤ ہے۔ اور ٹھہراؤ بغاوت کی موت۔ (مسکرا کر) میں بیٹھنا نہیں چاہتا۔ (سینہ پھلا کر) میں آپ کے مقابلہ میں کھڑا رہنے کا عزم کر چکا ہوں۔
مسٹر زیڈ:۔ ابھی ہم نے مسٹر سی کے خیالات معلوم کئے ہیں۔ شاید کہ آپ لوگوں میں مستقل مزاجی ہے
مسٹر آر:۔ (فاتحانہ مسکرا کر) مجھے یہ سنکر خوشی ہوئی کہ آپکو ہماری مستقل مزاجی اور اپنی غلطی کا احساس ہو گیا
مسٹر زیڈ:۔ (سگریٹ کا کش لیکر) لیکن دیکھو بھئی اس طرح ہٹ دھرمی سے تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تمھارا جذبہ آزادی صحیح ہے۔ لیکن انقلاب کے ذریعہ کسی چیز کو حاصل کرنیکی کوشش کرو۔ انقلاب ہر چیز کی موت ہے۔ حتیٰ کہ انقلاب کے دھارے میں خود انقلاب کی روح بہ جاتی ہے۔ اور چٹیل سے میدان کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا
مسٹر آر:۔ (طنزیہ مسکرا کر) دلائل حقیقت کی کسوٹی قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ حقیقت کو جھٹلانا صرف دلائل ہی کا کام ہے۔ (جوشیلے لہجہ میں) لیکن ہماری روح کو جس قدر کچلا گیا ہے۔ ہمارے جذبات کا جس طرح مذاق اڑایا گیا ہے وہ انقلاب ہی چاہتے ہیں۔۔ (افسردہ لہجہ میں) ہمارے اس چھوٹے سے قصبہ میں کیسا امن و امان تھا لیکن یہاں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ اور اس کے بعد ہر طرف شیطانی قہقہے فضا میں گونجنے لگے۔ وہ دوشیزائیں جن کی معصومیت اور پاکیزگی فرشتے چرا لیا کرتے تھے۔ ایک بھی دوشیزہ نہ رہی۔ سب کی عزّت و ناموس پر ڈاکے پڑے۔ اُن میں سے بہت سی خودکشی کی نذر ہو گئیں۔ بہت سی کوٹھوں کی رونق بن بنکر گاہکوں سے اشارہ بازی کرنے لگیں اور بہت سی ایسے امراض کی شکار ہو گئیں جنکا کوئی علاج نہیں۔ ایسے حالات میں بھی اگر مردوں کی روح بیدار نہ ہو تو اُن مردوں پر لعنت ہے۔
مسٹر زیڈ:۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں ——
مسٹر آر:۔ (قطع کلام کرکے)۔ افسوس نہ کیجئے ورنہ حکومت کی کرسی بیوہ ہو جائیگی۔ چمکدار چاندی سونے کے سکے۔ کسی کی جیب میں کھنکنے کے واسطے بیتاب ہو کر اپنی آب و تاب کھو دیں گے۔
مسٹر زیڈ:۔ (غصہ سے) لیکن اس بغاوت اور سرکشی کا انجام جیلخانہ کی تاریک کوٹھری ہے۔ سمجھ لو اسے۔
مسٹر آر:۔ مرحبا۔ اس تاریک کوٹھری پر جس میں روح جگمگا اٹھے۔ جہاں روح بیدار ہو۔ جہاں صحیح

جذبات کی تخلیق ہو۔ جہاں کی نیند میں بیداری ہو
جہاں کے خوابوں میں آزادی کے نغمے سنائی دیں
وہ تاریک کوٹھری جس کے مقدر میں ہو میں اس
مقدر پر رشک کرتا ہوں۔

مسٹر زیڈ: (کچھ سوچکر)۔ اگر تم قاتل کا پتہ تبلا دو تو
حکومت آزاد کردیگی۔ اور تمہارے ساتھ ہمدردانہ سلوک
بھی کرے گی۔

مسٹر آر:۔ اگر حکومت کی عقل کا اس قدر دیوالیہ ہوگیا ہے
تو میں سوائے ماتم کے اور کیا کرسکتا ہوں۔ ہاں
مجھے قاتل کا پتہ معلوم ہے۔ اور آپ بھی اسی اچھی طرح
جانتے ہیں۔ (جوشیلے لہجہ میں) وہ نفرت و حقارت
کا طوفان ہے جس کی موجیں اب اس قدر گستاخ
ہوگئی ہیں کہ اب وہ بندوں کو توڑکر طوفان لانے
کے لئے بیتاب ہیں۔ (دور دروازہ کی جانب
دیکھکر) کیا اب آپ مجھے جانیکی اجازت دیگے؟

(مسٹر زیڈ تالی بجاتا ہے۔ مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے
اور فوجی سلام کرکے کھڑا ہوجاتا ہے)

مسٹر زیڈ:۔ اور کوئی ہے؟ (مسٹر ایکس نفی میں سر
ہلاتا ہے) ان دونوں بدمعاشوں کو حراست
میں رکھو۔ (مسٹر ایکس فوجی سلام کرکے مسٹر آر کا
ہاتھ پکڑتا ہے)

مسٹر آر:۔ (مسکراکر) میں خوش ہوں کہ آپ مجھے
صحیح جگہ بھیج رہے ہیں۔ جہاں میری آزاد روح
اور ناقابل تسخیر جذبات آپ کے پیدا کئے ہوئے
فلسفۂ زندگی جسکا کھوکھلا پن اب ظاہر ہو چکا ہے۔
نذر ہوں گے (مسٹر ایکس کے ساتھ کمرہ سے نکلجاتا ہے)

مسٹر زیڈ اٹھکر خاموشی سے کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے
اور کچھ سوچتا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد مالک ہوٹل
داخل ہوتا ہے۔ اور مسٹر زیڈ کے پاس جاکر راز
دارانہ لہجہ میں)

مالک ہوٹل: حضور والا! ایک بوڑھی عورت آپ سے
ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ شاید اس سے کوئی پتہ
چل سکے۔

مسٹر زیڈ:۔ جلد لاؤ اسے۔

(مالک ہوٹل کمرہ سے نکلجاتا ہے اور چند سیکنڈ
بعد ایک بوڑھی عورت کو ساتھ لیکر داخل ہوتا ہے
اور اسے کمرہ میں چھوڑکر خود کمرہ سے نکل جاتا ہے
عورت کی عمر تقریباً پچاس سال کے قریب ہی جسوقت
وہ کسی چیز پر نظریں جماکر اسے دیکھتی ہے تو پیشانی
کے بل اس کے عزم و ارادہ کی پختگی کا اظہار کرتے ہیں

مسٹر زیڈ: کہو ماں! مجھسے کوئی کام ہے۔

بڑھیا:۔ ہاں تم حکومت کے ایک اعلیٰ افسر ہو۔ میں
تمہارے پاس ایک فریاد لے کر آئی ہوں۔

مسٹر زیڈ:۔ کہو کہو۔ میں تمہاری فریاد ضرور سنونگا اور
انصاف کرنے میں اپنی تمام کوششیں صرف کردونگا

بڑھیا:۔ میں ایک مظلوم عورت ہوں۔ میرا صرف
ایک ہی لڑکا ہے حسین اور عقلمند۔ وہ فوج میں
ملازم تھا جنگ شروع ہوئی اور اس نے جنگ پر
جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ جنگ کے نعرے کچھ اور تھے
روح کچھ اور۔ جسے اس نے سمجھ لیا ملک و قوم کیلئے
وہ جان دے سکتا تھا مگر غلامی کی زنجیریں اور مضبوط
کرنے کے واسطے نہیں۔ اب آپ ہی تبلائیے کہ یہ
اس کے ساتھ ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے اسے
جیل خانہ کی کوٹھری میں ٹھونس دیا گیا ہے۔

مسٹر زیڈ: تو ماں صرف تمہارے ایک ہی لڑکا ہے۔

بڑھیا:۔ ہاں میرا ایک ہی لڑکا ہے۔

مسٹر زیڈ: تم اس سے محبت بھی کرتی ہو؟

بڑھیا:۔ بے پناہ ۔۔ کون اپنی اکلوتی اولاد سے محبت نہیں کرتا؟

مسٹر زیڈ:۔ اور تم یہ بھی چاہتی ہو کہ وہ آزاد کر دیا جائے

بڑھیا: کیوں نہیں۔ وہ کونسی ماں ہے جو اپنی اولاد کی آزادی
کی خواہشمند نہیں؟

مسٹر زیڈ:۔ (بڑھیا کا چہرہ غور سے دیکھکر) تمہارا اکلوتا لڑکا

آزاد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک شرط پر۔

بڑھیا:۔ وہ شرط بھی بیان کر دو۔

مسٹر زیڈ:۔ تو وعدہ کرو کہ شرط پوری کرو گی۔

بڑھیا:۔ اگر پوری کرنے کے قابل ہوئی تو ضرور پوری کروں گی۔

مسٹر زیڈ:۔ تو اس شخص کا پتہ بتلاؤ جس نے مجسٹریٹ کا قتل کیا ہے۔

(بڑھیا کے چہرہ پر غصّہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور وہ نفرت سے مسٹر زیڈ کا چہرہ دیکھتی ہے؟ کچھ دیر خاموش رہکر)

بڑھیا:۔ کیا آپ اس کو گرفتار کر سکیں گے؟

مسٹر زیڈ:۔ ہم اس کو گرفتار ہی نہیں کریں گے۔ بلکہ اسے فنا کر دیں گے۔

بڑھیا:۔ تو سن لیجئے۔ وہ دوشیزاؤں کی لُوٹی ہوئی عصمتیں ہیں۔ وہ غریبوں کی آہیں ہیں۔ وہ دولتمندوں کی عیش پرستی ہے۔ وہ آزادی کے خواب ہیں۔ وہ غلامی سے نفرت ہے۔ (جوش میں آکر) آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرے بچے سے میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ اگر میرے ایسے سو لڑکے بھی ہوتے تو میں انھیں آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتی۔ فخر و غرور سے سر اونچا کرکے چلتی اور لوگوں سے کہتی کہ میں نے اپنے سو بچے آزادی کی راہ میں بھینٹ دیئے ہیں۔ سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے میں بھی آنسو بہاتی مگر خوشی کے۔ یہ تو ایک ہی لڑکا ہے رہنے دیجئے اُس کو تاریک کوٹھری میں بند۔ یہی اس کی کامیابی ہے اور میں خوش ہوں کہ مجھے اُس کی آزادی نہیں ملک کی آزادی چاہیئے۔

مسٹر زیڈ:۔ دیکھو ماں۔ بلا وجہ کی ہٹ نہ کرو۔

بڑھیا:۔ مجھے ماں نہ کہو۔ بوڑھی عورت جو وقت ماں کا لفظ سنتی ہے تو اس کے دل سے محبت کے سوتے پھوٹ نکلتے ہیں۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

(مسٹر ایکس گھبرایا ہوا کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور جلدی جلدی کہنا شروع کرتا ہے)

مسٹر ایکس:۔ حضور والا! ایک شخص جو کئی روز سے جیلخانہ میں بند تھا قاتل کا پتہ دینے کے لئے تیار ہے جلد از جلد اس کا بیان قلم بند کیجئے۔ ورنہ کہیں ــــ

مسٹر زیڈ: فوراً اسے حاضر کرو۔

(مسٹر ایکس کمرے سے نکل جاتا ہے اور مسٹر زیڈ بڑھیا کی موجودگی کے احساس سے قطعی بے پروا ہوکر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ مسٹر ایکس نوجوان کو لیکر داخل ہوتا ہے نوجوان اور بڑھیا کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نوجوان بڑھیا کو دیکھ کر ایسے لہجے میں جس میں نفرت اور طنز دونوں موجود ہیں)

نوجوان: کیوں ماں مجھ سے بہت محبت ہے ــــ اس محبت میں کس بے قصور کی گردن کٹوانے کا ارمان دل میں ہے ــــ ماں میں ــــ

بڑھیا: (قطع کلام کرکے) مجھے بار بار ماں نہ کہہ (نفرت سے دوسری جانب منہ پھیر لیتی ہے) اگر تو پیدا ہی نہ ہوتا تو میں خوش ہوتی ــــ ذلیل بزدل کہیں کا ــــ کس کی گردن کٹوانا چاہتا ہے۔ (پھر ایکدم پلٹ کر نوجوان کے پاس جاکر) تجھ جیسے غدار کو دنیا میں رہنے کا حق نہیں ــــ (ایک چھپے ہوئے خنجر سے نوجوان پر حملہ کرتی ہے) قبل اس کے کہ تو کسی کا نام بتلائے میں تیری زبان ہمیشہ کے واسطے بند کر دینا چاہتی ہوں۔ (مسٹر ایکس دوڑ کر بڑھیا کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اس کے پاس پہنچے خنجر اپنا کام کر چکتا ہے۔ مسٹر ایکس اور زیڈ حیران کھڑے رہ جاتے ہیں۔ نوجوان فاتحانہ مسکرا کر بڑھیا کو دیکھتا ہے۔ پھر خنجر سینے سے نکالتے ہوئے)

نوجوان: ماں! میں نے زندگی کی عین راحت حاصل کر لی ہے۔

میں خوش ہوں کہ میری زندگی تمہارے صحیح جذبات کی نذر ہوئی۔ (پھر چند سکنڈ کھڑا رہتا ہے۔ خنجر ہاتھ میں لیکر لڑکھڑاتا ہوا مسٹر زیڈ کے پاس جاتا ہے)۔ میں آپ کو قاتل کا نام بتلانا چاہتا ہوں۔ (ایک دم مسٹر زیڈ پر خنجر سے حملہ کرتا ہے اور مدافعت سے پہلے ہی خنجر مسٹر زیڈ کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ گر پڑتا ہے) اب سن لیجئے اس قاتل کا نام —— مجسٹریٹ کا قاتل اب آپ کا بھی قاتل ہو چکا ہے۔

(نوجوان یہ کہتا ہوا فرش پر گر پڑتا ہے۔ دونوں کے سینوں سے خون فرش پر مختلف سمتوں میں بہنے لگتا ہے)۔

بڑھیا: بیٹا! —— (اس پر جھک کر) — میرا بہادر بیٹا۔

نوجوان: (اپنے دونوں ہاتھ عورت کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے)۔ ہاں! زندگی کا مقصد —— آزادی حاصل کرنا ہے —— میں اس قدر بزدل تو —— نہیں ہوں کہ —— جو کام میں نے آزادی کی —— خاطر کیا ہے اسے پوشیدہ رکھ کر —— غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرا دوں —— اور پھر اس ظالم گورنمنٹ کے ظلم کا نشانہ کوئی ایسا بے قصور —— بن جائے جس سے —— ہماری تحریک آزادی کو بہت سی امیدیں ہیں۔

بڑھیا: جب آزادی کی خواہش جوشیلی نہیں بلکہ سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ جب نفرت وحقارت کے جذبات زندگی سے وزنی ہو جاتے ہیں۔ پھر تحریک آزادی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا سمجھئے کہ اب ہم پس وپیش کے دوراہے پر نہیں کھڑے ہیں۔ ہم نے آزادی کی راہ پر قدم بڑھا دیا ہے اور غلام آباد کو جانیوالی سڑک کو ڈائنامیٹ لگا کر ہمیشہ کے واسطے فنا کر دیا ہے۔

(نوجوان کے ہاتھ ڈھیلے ہو کر بڑھیا کی گردن کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بڑھیا کی آنکھوں سے دو آنسو نوجوان کے بہتے ہوئے خون پر گر کر جذب ہو جاتے ہیں۔ بڑھیا کھڑی ہو کر نوجوان کی لاش کو فاتحانہ انداز میں مسکرا کر دیکھنے لگتی ہے۔ بادل زور سے گرجتا ہے اور تیز ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہوتے ہیں، دور سے انقلاب زندہ باد — آزادی ہمارا حق ہے — غلام رہنا بے عزتی ہے — کی آوازیں آتی ہیں جو آہستہ آہستہ تیز ہوتی جاتی ہیں۔ مسٹر ایکس دوڑ کر کھڑکی کے پاس جاکر کھڑکی بند کرتے ہوئے)۔

مسٹر ایکس: غضب کی تیز ہوا ہے۔

بڑھیا: طوفان ہے طوفان —— وہ ان بند دروازوں کو توڑ ڈالے گا —— (پھر نوجوان کی لاش کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے) دیکھ بیٹا آخر طوفان آ ہی گیا۔

پردہ

(انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال میں پڑھا گیا)۔

(بقیہ صفحہ ۳۴) آج خود بخود ٹہپ پڑی تھی —— اور اب —— اب راستہ بالکل صاف تھا۔ صرف معمولی سا ملبہ —— جسے دور کرنے میں ذرا بھی وقت نہ تھی۔

"ہے ہے! دیکھو تو ستہ ہو گیا ہے غریب کو" کوئی پُرنم آنکھوں سے ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا۔

"سناٹہ —— !"

وہ جھنجھلا پڑا۔ نہ جانے ہمدردی کے ایک اس بول میں کیا تھا کہ اس کے بھرے ہوئے تمام باغی خیالات، خاموشی سے اپنے لئے راہ بنا کر نہ جانے کہاں بہہ گئے اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کی تمام شرافت، انسانیت اور نیکی بھی —— لوگوں کی وہ تمام باتیں جنھیں سنکر اس کی رگوں میں جوش ہی جوش بھر جاتا تھا —— اور جنھیں سنکر وہ خود کو ایک ارفع ہستی سمجھنے لگتا تھا۔ اب صرف ایک جملے پر ختم ہو جائیں گی "اوہ! کتنا دکھ اٹھایا ہے غریب نے!" اب کوئی اُسے یہ نہ کہیگا "تمہاری دقت کو پتلاتا ہے بالکل —— ارے، فرشتہ کہو"

اف! وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جائزے

فلسفۂ عمر خیام

اس بار

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

صفدر اسرائیلی

فلسفۂ عمر خیام

شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو خیام سے واقف نہیں جس نے خیام سے فیض حاصل نہیں کیا، جس نے اُس کی منطق اُس کی شاعری، اور فلسفہ کی چاشنی نہیں چکھی۔ اس بیداری کے دور میں عمر خیام اور اُس کے فلسفے سے کما حقہٗ واقفیت ازبس ضروری ہے۔ فزجرالڈ (Fitzgerald) جیسی معدودے چند ہستیوں نے اُس کے فلسفہ کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور قدم قدم پر رباعیاتِ عمر خیام میں "زندگی" کو جلوہ نما پایا ہے۔ حافظ شیرازی ہوں یا رومی، ٹالسٹائے (Tolistoy) ہوں یا سعدی..... عمر خیام ہوں یا امیر خسرو ان شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ: قاری کو پاک بیں اور پاکباز ہونا چاہئے، جیساکہ اقبال کا عقیدہ ہے ؎

نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود ؛ وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

شاعر دنیا کی بہترین مخلوق ہے، قدرت کا شاہکار ہے، والہانہ محبت سے اُس کی تخلیق ہوتی ہے، عشق کے سایہ میں وہ پرورش پاتا ہے اور جب وہ عشق کی کسوٹی پر پورا پورا اترتا ہے تو دنیا اُسے پیغامبر یا معمارِ اعظم (Master Builder) کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

جس ملک کا عمر خیام رہنے والا ہے، جس ملک کی صحت بخش ہواؤں میں وہ پلا ہے، جس فلسفہ کا وہ علمبردار ہے اُس کا ثمرہ ایشیا نہیں، عرب نہیں بلکہ مغرب اُٹھا رہا ہے۔ امریکہ نے خیام کو نوازا، انگلستان نے خیام کو سراہا، ریاستہائے یورپ نے رباعیات عمر خیام کا صمیم قلب سے خیر مقدم کیا۔ غرضکہ خیام نے اپنے جذبۂ آتش نفسی، والہانہ خلوص اور خود انتقادی (Self-criticism) سے مغربی ممالک میں وہ راگ الاپا کہ:

عشق بھی جھوم جھوم اُٹھا، حسن بھی مسکرا دیا

خیام اس دنیائے رنگ و بو سے، ایک ایسی شراب تیار کرتا ہے جس کا ایک جرعہ ہم کو دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ خیام عام شرابیوں کی طرح شراب نہیں پیتا، وہ ایسی شراب پیتا ہے جو انسان کو کور نظر، کور باطن و کافر صفت نہیں بناتی بلکہ ایک ایسا سالک بنا دیتی ہے جو تا ابد ہماری کشمکش حیات میں شمع راہ بنکر ہماری گتھیوں کو سلجھاتا اور ہماری مشکلات کو حل کرتا ہے۔ فنکار کی حیثیت سے خیام کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ وہ ہماری بے حس قوتوں کو چونکاتا ہے، سوتے جذبات کو جگاتا ہے، دلوں کو گرماتا ہے، مردہ جذبات کو زندہ کرتا ہے، حوصلوں کو بڑھاتا ہے، مصیبت میں تسکین دیتا ہے۔ اُس کا کلام قنوط و جمود، فرار یا رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ رجائیت، عملی زندگی اور زندہ دلی کی بہترین تفسیر ہے۔

اگر جرمنی نطشے (Nietzsche) کے شاہکار "زردشت" کو الہامی تصور کرتا ہے۔ اگر ہندوستان ویدوں کو مقدس مانتا ہے تو ہم بھی "رباعیاتِ عمر خیام" کو الہامی کتاب ماننے کو تیار ہیں چونکہ خیام کی زبان وہ الہامی زبان ہے جو بیک وقت ہمارے ذوقِ جمال، ذوقِ فکر اور ذوقِ عمل کو حرکت میں لاکر زندگی اور اُس کی گوناگوں دلچسپیوں سے آشنا کراتی ہے۔ رباعیات عمر خیام کا تو کہنا ہی کیا صرف پہلی رباعی کا مطالعہ ہی قاری کو مست و بیخود بنا دیتا ہے:

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما — کاے رندِ خراباتیٔ دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے — زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

تیسری رباعی ملاحظہ ہو:

مرد آں نبود کہ خلق خوارند اورا — وز بیم بدی نیک شمارند اورا
رندے کہ نمود روئے دستے بکرم — رنداں ہمہ پشتِ دست دارند اورا

دسویں رُباعی کی اہمیت اور ماہیت کا اندازہ کسی میخوار کے دل سے پوچھیئے ؎

مے قُوتِ جسم و قوتِ جانست مرا — مے کاشفِ اسرارِ نہانست مرا
دیگر طلبِ دنیا و عقبیٰ نہ کنم — یک جُرعۂ پُر از ہر دو جہانست مرا

شاید اس سے بہتر شراب کی تعریف آجتک کسی شاعر نے نہیں کی، مے "قوّت جسمانی" اور "کاشفِ اسرار نہانی" نہیں تو اور کیا شے ہے........؟!۔

غرضکہ خیام نے اپنا سجّادہ اس شان سے رنگین کیا ہے کہ آج امریکہ و یورپ کا رنگین مزاج طبقہ خیام کو اپنا "پیرِ مغاں" ماننے کو تیار ہے۔ ہم میں سے ہر وہ ادیب جو اس "پیرِ مغاں" کا پیرو ہے۔ کائنات کے ذرّہ ذرّہ اور چپّہ چپّہ کو مسخر کرسکتا ہے۔

ماہرِ نفسیات ہو یا افسانہ نویس، شاعر ہو یا فلسفی، یاسیت کا امام ہو یا رجائیت کا ــــ شاعرِ شراب ہو یا شاعرِ شباب ــــ غرضکہ ہر ادیب کے شاہکاروں یا ادبی کارناموں میں ہم زندگی کو رواں دواں پائیں گے، ادب کیا ہے؟ زندگی کا آئینہ، زندگی کی صحیح تفسیر و تنقید، یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ہم ادب کا پرتو ــــ زندگی پر اور ــــ زندگی کا پرتو، ادب میں رقصاں پاتے ہیں۔ زندگی کو مختلف فلاسفروں نے مختلف زاویۂ نگاہ (Angle of Vision.) سے دیکھا ہے مگر بہت کم فلسفی ایسے گذرے ہیں جنھوں نے ہماری زندگی کا کوئی خاص نصب العین یا لائحہ عمل ہمارے سامنے پیش کیا ہو اور ہم حقیقت پسندوں (Realists) نے اسے مان لیا ہو۔

سب سے پہلے نظریۂ نفسانیات (Hedonism) کو زمانے نے بہت نوازا، چونکہ یہ نظریۂ نفس امارہ اور نفس متبعہ (Lower Self) سے ہم آہنگ تھا۔ مسئلۂ نفسانیات کا جو پیغام تھا وہ بھی سُن لیجئے:

Eat and drink, for tomorrow we shall die —.

یعنی ———— امروز مے نوشیم، و فردا راکہ دید۔

آگے چل کر تدریجی جبریت نے مسئلہ افادیت (Utilitarianism.) کو پیدا کیا جس کے پُرجوش علمبرداروں میں بین تھم (Bentham.) اور مل (Mill.) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بین تھم کو مِل سے مریدانہ عقیدت تھی یا مِل کو بین تھم سے۔ اس کا جواب "تاریخ فلسفہ" کی کسی معتبر کتاب میں ملیگا۔ بہرحال مِل اور بین تھم کا نظریۂ افادیت اتنا گھل مل گیا ہے کہ وہ اُن کا اپنا نظریہ نہیں رہا ہے، دو نظریات کے اتصال سے ایک تیسری چیز بن گئی ہے جسے فلسفہ کی اصطلاح میں ارتقائی افادیت (Evolutionary Utilitarianism) کہتے ہیں۔ اس مسئلہ کا پیغام بھی ایک شعر میں عرض کئے دیتا ہوں۔

"مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
میں وہ گُل ہوں خزاں ہر گُل کی ہے گویا خزاں میری" (اقبالؒ)

ہر زمانہ صرف اپنے ارتقائی منازل طے کرتا چاہتا ہے بلکہ اپنی ضروریات کو بحسن و خوبی خود بخود پورا کر لیتا ہے،
جب دنیائے سائنس نے اپنی اختراعات اور ایجادات سے کمال حاصل کرنا چاہا تو فلاسفروں سے بھی نہیں رہا گیا، انھوں نے
فوراً مسئلہ اکملیت (Perfectionism.) دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مسئلہ اکملیت جس کو ہم اخلاقیات کا سرمایہ
کہہ سکتے ہیں اُس کا خطاب آج بھی سقراط کی طرح "خودشناسی" ہے، سج وگ (Sidgwig.) اور براڈے آج بھی
دنیا والوں کے جذبات و احساسات سے "خودشناسی" کی اپیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہمارے نزدیک خود انتقادی (Self-Criticism.) اور والہانہ خلوص کا نام ـــ خودشناسی ہے،
عمر خیام مسئلہ نفسانیات کا ہمنوا نہیں (جیسا کہ سطحی نقاد تصور کرتے ہیں) بلکہ عمر خیام مسئلہ اکملیت کا علمبردار ہے، اُس کے
اُس کے نزدیک:

مادیت اور روحانیت کے حسین امتزاج کا نام "اکملیت" ہے۔

خیام - طہیت کا ترجمان ہے، کبیر نفس ہے، بندۂ مولا صفات ہے، وہ ایک ایسا فلسفی ہے جسے نہ تو خود سے شکایت ہے
نہ خدا سے۔ اُسے دنیا سے بھی لگاؤ ہے اور دنیا والوں سے بھی۔ کیونکہ وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتا ہے کہ:

خدا سے محبت کرنے سے پہلے اُس کے بندوں سے محبت کرنا لازم ہے

دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ دنیا خیام کے نزدیک ایک میخانہ ہے یہ دنیا اس کے محبوب کی جلوہ
گاہ نہ ہے، وہ اس دنیا کا دیوانہ اور رند خراباتی ہے۔ دیکھئے خیام کشکشِ حیات کا حل کتنے حسین طریقہ سے
پیش کرتا ہے:-

برخیز و بیا بتا! برائے دل ما　　حل کن بجمال خویشتن مشکل ما
یک کوزہ مے بیار تا نوشش کنیم　　زاں پیش کہ کوزۂ کنند از گل ما

خیام اپنے ساز کے پردوں میں کچھ اس ادا سے نغمہ زن ہوا کہ کیا شرق و مغرب دونوں اس "پیر مغاں"
پر آج تک شیفتہ و فریفتہ نظر آتے ہیں۔ یہ خیام کی آفاقیت کا ادنیٰ سا ثبوت ہے،

خیام میں آکر موسیقی، شاعری، فلسفہ، غرضکہ جملہ فنون لطیفہ نے اپنے آپ کو کھو دیا ہے، ......
خیام کا سارا فلسفہ اور ساری اخلاقیات اس کی ایک ہی رُباعی میں موجزن ہے، ملاحظہ فرمایئے کس
والہانہ انداز سے "دعوت عمل" دیتا ہے:-

ـــ رو بے خبری گزیں، گر باخبری　　تا از کفِ مستانِ ازل بادہ خوری
تو بے خبری، بیخبری کار تو نیست　　ہر بے خبرے را نرسد بے خبری

کون نہیں جانتا شاعری "الہام" کا دوسرا نام ہے اور اس جدیدیت (Modernism.)
کے دور میں اس روشن حقیقت سے کون واقف نہیں، کہ شاعر کی زبان "الہٰی زبان" اور شاعر "تلمیذ الرحمٰن"
ہوا کرتا ہے،

شاعری ہماری روحانی اور مادی بیداری کی ذمہ دار ہے، شاعری ذریعہ ہے دل کی شگفتگی، ذہن کی تیزی اور
اخلاقی استواری کا، جہاں شعرائے عالم تربیت انسانی میں پاکیزگیٔ خیالات (Purity of thoughts.)
لطافت طبع اور شرافت نفسی (Purity of Self.) کی ترویج و ارتقاء کا باعث بنے، وہاں انھوں
نے قوم و ملت کی بیداری میں ایسا زبردست حصہ لیا اور ایسے ایسے انقلابات برپا کئے کہ وہ حرف بہ حرف تدین

میں ثبت جریدۂ عالم ہوئے، اسی جذبہ کے ماتحت حافظ بھی کہہ اٹھتے ہیں :-

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

ہومر (Homer.) اور ورجل (Vergil.) سے لیکر گیٹے (Goethe) نطشے (Nielzche.) فشتے (Fitchte.) شوپن ہار، لارڈ بائرن، فردوسی، رومی، سعدی، حافظ، عمر خیام حالی، اکبر اور اقبال کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے خیالات و نظریات انسانی میں انقلاب عظیم نہیں پیدا کیا۔ دنیا اور دنیا والے ان مشاہیر عالم کے رہین منت ہیں، شاعر کو "لسان الغیب" کہا گیا ہے اور یہ سچ ہے جب کوئی قوم نشۂ غفلت سے سرشار ہو کر ہلاکت کا شکار ہو جاتی ہے تو ایک سُریلی آواز اس کے کانوں تک پہنچتی ہے جسے سُن کر اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ جاگ اٹھتی ہے،

یہ آواز، یہ نغمۂ دلکش، شاعر کا ہوتا ہے،

مغربی ممالک میں روحانی بیداری کی ذمہ دار صرف دو ہستیاں ہیں:- ۱- ٹیگور --- اور --- ۲- عمر خیام

روزمرہ زندگی کے مشاہدات ہمارے تجربات میں اضافہ کرتے ہیں ۔ مشاہدات و تجربات نظریات ( ) کی تخلیق کرتے ہیں، نظریات کا میدان عمل ہماری زندگی ہوا کرتی ہے انھیں نظریات کی بناء پر ہر بڑے شاعر اور فلسفی نے اپنا خود کا نظام تمدن یا فلسفۂ زندگی پیش کیا ہے، دنیا اس کو مانے یا نہ مانے یہ اور بات ہے، ہماری کشمکش حیات کا حل ہر بڑے شاعر اور فلسفی نے پیش کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر بڑے شاعر اور فلسفی کا کلام اور تصنیف ایک خاص نظام تمدن، یا فلسفۂ زندگی کا آئینہ دار ہوا کرتی ہے،

رباعیات عمر خیام مرد مومن ( )، کو نفس مطمئنہ ( ) اور نفس کامل ( ) کی دو بڑی نعمتیں عطا کرتی ہیں جس کی روشنی میں ہم ظلمت شب میں سحر کو جلوہ نما پاتے ہیں اور ایک مستانہ و والہانہ انداز سے کشمکش حیات میں ... کا لطف اٹھاتے ہیں ۔ مطالعہ کے دوران میں ہمیں ہر سطر پر اس امر کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ ہمارا حال ماضی سے بہتر اور ہمارا مستقبل حال سے زیادہ شاندار ہے ہمیں ایسا کیوں معلوم ہوتا ہے اس کا جواب آپ کو رباعیات عمر خیام میں ملے گا ۔

عمر خیام نہ صرف مست و بیخود ہے، بلکہ وہ دوسروں کو بھی مست و بیخود بنا دیتا ہے، پاکباز اور رند میں ہستیوں کیلئے عمر خیام کی رباعیات کا ایک ایک شعر ان کے دل و دماغ پر رحمت بن کر چھا جاتا ہے، صرف خیام کے کلام میں ہی یہ بات پائی جاتی ہے کہ اس کا کلام کیا گنہگاروں اور کیا پرہیزگاروں دونوں کے لئے یکساں طور پر پیام زندگی ہے یہی خوبی انجیل مقدس ( ) میں بھی پائی جاتی ہے، ہمارے نزدیک بلا شبہ "رباعیات عمر خیام" ایک الہامی کتاب سے کسی طرح بھی کم نہیں،

رو بے خبری گزیں گر با خبری　　تا از کف مستان ازل بادہ خوری
تو بے خبری، بے خبری کار تو نیست　　ہر بے خبرے را نرسد بے خبری

ادارہ

اس بار

زیر تبصرہ حسب ذیل کتابیں ہیں

اور ڈان بہتا رہا

مشہور روسی افسانہ نگار مائیکل شولوخوف کا بے پناہ ناول، ساری دُنیا میں مشہور ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہو کر قبول عام و خاص حاصل کر چکے ہیں۔

—..... اور ڈان بہتا رہا اسی ناول کا اردو ترجمہ ہے، جسے مخمور جالندہری اور سراج الدین احمد نظامی نے کیا ہے، اور مکتبہ جدید لاہور نے شائع کیا ہے، یہ ناول روسی انقلابی تحریک کا بہترین عکس ہے، جسمیں پچلے ہوئے عوام اور روندی ہوئی انسانیت کے روح فرسا واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، — نہ صرف یہ بلکہ انقلاب کے بعد کی نئی دُنیا کے حیات آفریں نقوش بھی اُجاگر کئے گئے ہیں۔

.... اور ڈان بہتا رہا — مردہ اور زندہ روس کی عوامی جدوجہد کا وہ آئینہ ہے جسمیں ہر ملک اور خصوصاً ہندستان کے انقلاب کی چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی تصویریں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ترجمہ میں خاصی روانی ہے۔ البتہ کہیں کہیں زبان اور بیان میں چند ایک خامیاں ہیں۔ جو اس لیے قابل نظر انداز ہیں کہ ناول از آغاز تا انجام نہایت دلچسپ اور کافی مؤثر ہے — پڑھنے والا زندہ قوم کی زندہ روایات کا جائزہ لیتے وقت ایسی ذیلی چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

سفید کاغذ، کتابت و طباعت اچھی — سرورق جاذب نظر صفحات ۶۳۲ قیمت مجلد آٹھ روپیہ (۸ ؎)

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جدید (انارکلی) لاہور

طشت از بام

وجاہت سندیلوی، ملک کا مایۂ ناز ترقی پسند افسانہ نگار ہے — طشت از بام اس کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جسمیں ۲۶ افسانے شامل ہیں، ہر افسانہ نئے پلاٹ اور نئی ٹکنیک کا حامل ہے، وجاہت کے قلم میں بلا کی کشش اور غضب کا طنز ہے — ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کے رستے ہوئے ناسوروں پر یہ فنکار کمال چابکدستی سے نشتر زنی کرتا ہے! غلام آباد کی سسکتی ہوئی مخلوق کا ہر گوشہ اس کے پیش نظر ہے۔ چنانچہ اس کے افسانے بھی عوامی پستی اور بدحالی کے بہترین نمونے ہیں جن میں اس کا کوئی حریف نہیں، — افتاد طبع کے ہاتھوں یہ فن کار اپنی تخلیقات جلد جلد عوام کے سامنے نہیں لاسکا اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک اُسے وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ عرصہ سے مستحق ہو چکا ہے،

سفید چکنا کاغذ۔ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۵۶ — قیمت دو روپیہ بارہ آنہ (۱۲/ ؏)

ملنے کا پتہ:- وجاہت سندیلوی۔ نصرت منزل سندیلہ (یوپی)

آوارہ گرد کے خطوط!

"ش" مظفر پوری صوبۂ بہار کا ایک ہونہار نوجوان، ترقی پسند افسانہ نگار ہے جس نے تھوڑے ہی عرصے میں ہندستان گیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ آوارہ گرد کے خطوط "ش" کے افسانوں کا بہترین مجموعہ ہے جس میں کم و بیش دس طویل و مختصر افسانے شامل ہیں۔ انفرادیت "ش" کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جو اُس کے ہر افسانے میں نمایاں ہے۔ اُس کے افسانے عموماً سماج کے تاریک اور گھناؤنے رُخ کے آئینہ دار ہیں۔ وہ جب حقیقت نگاری پر آتا ہے تو زندگی کی تلخیوں اور محرومیوں کو واقعاتی رنگ میں پیش کئے بغیر نہیں رہتا — اور یہی ایک سچے افسانہ نگار کی بہت بڑی خوبی ہے۔

"آوارہ گرد کے خطوط" ناشر کی بدذوقی پر ماتم گسار ہیں جس نے مصنف کی بہترین تخلیقات کو نہایت بھونڈے پن سے پیش کیا ہے۔ کاش ہمارے ناشران کرام مصنف کے دل و دماغ کی صحیح قیمت اُس کی تصنیفات کو صحیح طریقہ سے عوام کے سامنے پیش کر کے ادا کر سکیں۔ کتابت و طباعت نہایت معمولی، سرورق غیر دلچسپ، صفحات ۲۲۴۔ قیمت ڈھائی روپے (ع۲/۸)۔ ناشر: مکتبۂ ادب اُردو بازار۔ دہلی۔

جلترنگ

زینت ساجدہ حیدر آباد کی نئی افسانہ نگار خاتون ہیں جنھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ جلترنگ — زینت کے دس افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ زبان و بیان میں خاصی روانی ہے۔ اگر طرز نگارش کا یہی عالم رہا تو مستقبل قریب میں زینت ساجدہ صف اوّل کے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگیں گی۔ جلترنگ کے زیادہ افسانے گردو پیش کے تلخ و شیریں حقائق کے آئینہ دار ہیں۔

کتابت و طباعت غنیمت۔ صفحات ۱۶۰۔ قیمت مجلد دو روپیہ (عگر)۔

ملنے کا پتہ: نیو پبلشنگ ہاؤس۔ بازار عیسٰی میاں، حیدر آباد دکن۔

ٹیسیں

یہ بھی حیدر آباد کے ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان افسانہ نویس آزاد صحرائی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں کم و بیش آٹھ افسانے شامل ہیں اور جس کا دیباچہ ملک کے مایۂ ناز افسانہ نگار ابراہیم جلیس نے لکھا ہے۔ آزاد صحرائی کی ٹیسیں کافی اثرانگیز ہیں، اُن کے افسانوی کردار اکثر و بیشتر جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں — جہاں تک مقصد کا تعلق ہے آزاد اپنی طرز نگارش میں کامیاب ہیں — سماج کی نئی قدروں کو اُجاگر کرنا ٹیسیں کی بنیادی خصوصیت ہے۔ امید کہ آزاد صحرائی جدید افسانوی تکنیک کو پیش نظر رکھ کر برابر ترقی کرتے رہیں گے۔

کتابت و طباعت غنیمت صفحات ۱۸۴۔ قیمت مجلد دو روپیہ چار آنے (عہر)۔

ملنے کا پتہ: ادارۂ داستان۔ ۷۸۷ سانچہ توپ۔ حیدر آباد دکن۔

ملے جلے افسانے

اُردو اشاعت گھر کلکتہ کی یہ تیسری پیشکش ہے۔ ملے جلے افسانے مقصود یوسف عثمانی نے مرتب کئے ہیں۔ ان میں سے بعض طبع زاد ہیں اور بعض ترجمے — افسانے جدید سے زیادہ قدیم موضوع کے حامل اور خاصے دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔

ملے جلے افسانے افسانہ نگاروں کے تعارف کے بغیر شریک انتخاب کئے گئے ہیں — ضرورت تھی کہ لکھنے والوں کا مختصر تعارف بھی کرا دیا جاتا — امید کہ اُردو اشاعت گھر آئندہ بلند پایہ فنکاروں کے تعاون سے بلند سے بلند تر ادبی مجموعے پیش کر کے اُردو زبان و ادب کے سرمائے میں معتدبہ اضافہ کریگا۔ کتابت و طباعت واجبی صفحات ۱۰۴۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)۔ ملنے کا پتہ:

اردو اشاعت گھر نمبر ۴۴۔ فیرس لین۔ کلکتہ۔

صد پارۂ دل

خواجہ دل محمد، ریٹائرڈ پرنسپل اسلامیہ کالج، لاہور۔ ملک کا بلند پایہ اور بالغ نظر شاعر ہے۔ "صد پارۂ دل" ان کی سو رباعیات کا گرانقدر مجموعہ ہے جس کا "سرِ آغاز" سر عبدالقادر نے تحریر فرمایا ہے۔ رباعیات میں سلاست و روانی ہے، اور گہرا تفکر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ مجموعہ نہایت سلیقے سے پانچ ابواب — "میخانۂ عرفاں"، "طلسمِ شہود"، "سرِ رودِ حقائق"، "اعمال و اخلاق" اور "نیرنگِ جذبات" پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں بیس رباعیات ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ موضوع کے لحاظ سے بیحد کامیاب اور اثر انگیز ہیں۔

"صد پارۂ دل" یقیناً اس قابل ہے کہ مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ سفید چکنا کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، صفحات ۲۷۲ — قیمت مجلد تین روپیے (ستر)۔ ملنے کا پتہ: خواجہ بک ڈپو، موہن لعل روڈ۔ لاہور۔

سدرۃ المنتہیٰ

سیماب اکبرآبادی کا دوسرا دیوان غزلیات جس میں سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک کی غزلیات شامل ہیں "سدرۃ المنتہیٰ" کے دلکش انگیز نام سے مکتبۂ قصر الادب آگرہ نے شائع کیا ہے۔ سیماب ہندستان کا وہ عظیم المرتبت شاعر ہے جس کے ادبی کارنامے اور تعمیری اقدامات باوجود نظریاتی اختلافات کے کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ وہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی صلاحیتیں لیکر آیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔ "سدرۃ المنتہیٰ" کی غزلیات میں سیماب کا اچھوتا رنگِ تخیل اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ کار فرما ہے۔

ایسے زندہ جاوید شعراء کی تخلیقات کا مطالعہ فکر و نظر کے سوتوں کو وسعت دینے کے مرادف ہے! معمولی کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، دلکش گرد پوش صفحات ۲۰۷ — قیمت مجلد چار روپیے (للعہ)۔

ملنے کا پتہ: مکتبۂ قصر الادب — آگرہ۔

بہترین نظمیں اور منتخب نظمیں

سنہ ۴۶ء کی بہترین نظمیں مکتبۂ اردو اور منتخب نظمیں نیا ادارہ لاہور نے شائع کی ہیں۔ مکتبۂ اردو پچھلے پانچ سال سے برابر نظموں کا سالانہ انتخاب پیش کر رہا ہے۔ اس بار نیا ادارہ نے بھی سنہ ۴۶ء کی منتخب نظمیں پیش کی ہیں — دونوں مجموعے تجارتی نقطۂ نگاہ کے غماز ہیں۔ جہاں تک نظموں کے انتخاب کا تعلق ہے برائے نام کمی بیشی ہے ورنہ دونوں مجموعوں کے مرتبین نے سنہ ۴۶ء کی بہترین نظموں کا یکساں انتخاب پیش کیا ہے۔ ان نظموں کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ مرتب کی نگاہیں صرف چند مخصوص شعرا اور محدود رسائل تک مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں۔ ادبِ لطیف یا ہمایوں — ساقی یا ایک آدھ کوئی اور رسالہ اور بس! درانحالیکہ سال سنہ ۴۶ء میں نظام، افکار، اور رباب وغیرہ نے بھی بہترین نظموں کے تخلیقی جواہر پارے پیش کئے جو ہر آئینہ انتخاب میں آنا چاہئے تھے، مگر افسوس کہ مرتبین ذاتی اختلافات اور مسابقت کے جذبے کے تحت صرف تجارتی ادب کو فروغ دینے کے لئے یہ مجموعے جلد از جلد مارکیٹ میں لے آئے اور شاید اسی لئے نگاہ انتخاب تین چار رسالوں تک محدود ہو کر رہ گئی —

تاہم پیش کردہ نظمیں آج کل کے ادب کی ترجمان ہیں — دونوں مجموعے بہترین کاغذ امتیازی کتابت و طباعت کے حامل ہیں — بہترین نظمیں ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ) اور منتخب نظمیں ایک روپیہ چار آنے (عہ) میں حسب ذیل پتوں سے مل سکتی ہیں — ذی الذکر کے صفحات ۱۴۳، اور موخر الذکر کے ۱۲۷ — !

مکتبہ اردو۔ لاہور — نیا ادارہ — لاہور

محسوسات

رشید نخوتی جالندھری، شاگرد حضرت نخوتی لکھنوی کا پہلا مجموعۂ کلام "محسوسات" کے نام سے شائع ہوا ہے!۔ "محسوسات" میں سبھی کچھ موجود ہے — نظمیں بھی، غزلیں بھی، اور قطعات بھی — ابھی چونکہ نخوتی شاعری کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہے اس لئے "محسوسات" پر تنقیدی نگاہ ڈالنا قبل از وقت ہے — "محسوسات" کی [illegible]

اس لحاظ سے بھی از بس ضروری ہے کہ فخری کا فن ابھی ناپختہ ہے۔ بہرحال یہ توقع بیجا نہیں کہ فیضِ استاد سے فخری آئندہ اس سے بلند مجموعے پیش کر کے اردو زبان و ادب کی ٹھوس خدمت کرے گا۔ معمولی کاغذ کتابت و طباعت قیمت۔ صفحات ۱۹۰۔ قیمت مجلد دو روپیہ (عگار)۔ ملنے کا پتہ: رشید فخری جالندھری نمبر۔ محلہ شاہ روشن ولی۔ جالندھر شہر۔

نیا دَور (بنگالی افسانہ نمبر)

حال ہی میں دو ماہی رسالہ نیا دور بنگلور نے جدید بنگالی افسانوں کا ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے جو ہر جہت سے کامیاب اور قابل قدر ہے۔ اس نمبر کے مرتب صمد شاہین اور ممتاز شیریں ہیں جنھوں نے اس کی ترتیب میں کافی دقت نظری اور محنت کا ثبوت دیا ہے۔ بنگالی تہذیب و ثقافت، اخلاق معاشرت اور ترقی یافتہ ادبی نظریات سے اردو داں طبقہ عموماً واقف نہیں —— صمد شاہین اور ممتاز شیریں کی یہ فنکارانہ پیشکش اس لحاظ سے بھی یقیناً قابل ستائش ہے کہ انھوں نے بنگالی افسانوی ارتقاء سے اردو ادب کو روشناس کر کے ایک بیش بہا خدمت انجام دی ——!

بنگالی افسانے نہایت محنت سے اردو میں منتقل کئے گئے ہیں جن میں اصل افسانوں کی روح بڑی حد تک موجود ہے —— سیڑھی، اتارا اور مگرمچھ اس نمبر کے بہترین افسانے ہیں۔ ابتدا میں ممتاز شیریں نے بنگالی افسانہ نگاروں کا نہایت دلکش انداز میں تعارف کرایا ہے اور آخر میں یونس احمر نے "جدید بنگالی افسانہ" کے عنوان سے ایک دقیق اور جامع مقالہ پیش کیا ہے۔

مصنفوں اور مترجم . . . تصاویر نے بھی جدید بنگالی افسانہ نمبر کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔
سفید کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔ صفحات ۲۸۰۔ قیمت دو روپئے چار آنے (عہ)۔
ملنے کا پتہ: نیا دور۔ ۶۲ خلاصی پالیم۔ بنگلور سٹی۔

(بقیہ صفحہ ۳۴) میں ڈوبنے لگا ہوں اور جیسے مجھ سے تنکے کا سہارا بھی چھین لیا گیا ہو۔ جیسے میرے دھڑکتے ہوئے دل پر کسی نے بوجھل اور وزنی سل رکھ کر اسے دبا دیا ہو جیسے میرے ذہن اور روح پر جلتا بھڑکتا ہوا تیل ڈال کر کسی نے آگ لگا دی ہو —— آگ —— دھواں —— اندھیرا۔ میرے اردگرد تاریکیاں مہیب خوفناک ڈائنیں بن کر ناچنے، منھ چڑانے، قہقہے لگانے لگیں۔ میں چلتی گاڑی میں بمشکل اپنے ڈبے میں یوں آگیا جیسے کوئی جواری اپنا سارا دھن ہار کر کوٹھری میں آگرے۔ سارے ڈبے پر پرہول مرگھٹ ایسی خاموشی مسلط تھی۔ اس طرف جلتا ہوا بلب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حسرتوں اور ناکامیوں کے قبرستان میں دیا جل رہا ہو اور گاڑی کے بے ہنگم شور میں سوئے ہوؤں کے خراٹے اس طرح ابھر ابھر کر ڈوب رہے تھے جیسے ویران سکوت کی سنگین دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر رہے ہوں اور شدتِ احساسِ غم سے میری آنکھوں میں ناکامی حسرت و بیچارگی کے آنسو آگئے۔ میں نے دھندلائی نظروں سے ڈبے میں دیکھ کر کھڑکی سے باہر منھ نکال دیا، جہاں میرے آنسو لرزتے کلپتے ہوئے ستاروں کی طرح تاریک خلاء میں پھسلتے گئے۔ معاً مجھے یاد آیا کہ میں اپنی ماں کے پاس جا رہا ہوں اس احساس نے مجھے پھر تھام لیا۔ میں نے آنسو پونچھ لئے۔ گاڑی گھنی تاریکیوں کے بیچوں بیچ یوں بھاگتی جا رہی تھی جیسے سیاہ گھناؤنے بادلوں کے درمیان بجلی کڑکتی ہوئی لہریں کرتی اور سمٹ کر پھیلتی جائے۔ میں نے ایک لمبا سانس لے کر سوچا کہ یہ گاڑی مجھے اس کے پاس لے جا رہی ہے ... جو میری تخلیق کا سرچشمہ ہے —— جو دکھ، درد اور یاس کا سہارا بھی ہے اور خاتمہ بھی!!۔

نمائندۂ نگار مقیم بمبئی کے قلم سے!

فلمستان

جوش پروڈیوسر بن گئے!

پونا اور بمبئی کے فلمی حلقوں میں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ ڈائرکٹر ذیڈ احمد نے جوش ملیح آبادی کے اشتراک سے ایک نئی فلم کمپنی کے قیام کے لئے سرمایہ اکٹھا کر لیا ہے۔ تفصیلات کا انتظار ہے۔

سائن ٹون!

افسوس کہ سائن ٹون لمیٹیڈ لکھنو کی پہلی تصویر "رشید دلہن" لکھنؤ کی روایتی بے حسی کا شکار ہوگئی۔ مسٹر نسیم سندیلوی لکھنؤ میں اس صنعت کو دوبارہ زندہ کرنے کی انتھک کوشش کر رہے تھے، مگر ایک مقامی اسٹوڈیو کے ارباب بست و کشاد نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا چنانچہ اس کمپنی نے اندھیر کھاتے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک جوتے کا کرایہ ۸/۶۷ روپیہ۔ اور ایک کالی شیروانی کا کرایہ چار پانچ سو روپئے لیا گیا ہے۔ بہرحال ہمیں نسیم سندیلوی کی ہمت اور ان کی کوششوں سے امید ہے کہ وہ جلد از جلد "رشید دلہن" کی رونمائی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

او جانے والے!

نو ہند پکچرز لمیٹیڈ کے ہونہار پروڈیوسر مسٹر ایس۔ آر۔ ڈیسائی "او جانے والے" کو پروڈیوس کر رہے ہیں۔ شوٹنگ نہایت تیزی کے ساتھ جاری ہے جو عنقریب ہی منزل تکمیل تک پہنچنے والی ہے۔ امید ہے کہ نو ہند پکچرز کا اولین شاہکار مقبول خاص و عام ہوگا۔ تصویر کے موسیقار ماسٹر علی حسین ہیں اور گانے والے اسکرین پلے مشہور ڈرامہ نگار کیفی مرادآبادی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اداکاروں میں ماہ لقا ڈیسائی۔ تلوک کپور۔ اوما کانت پانڈے۔ مہر سلطانہ۔ حسنہ وغیرہ شامل ہیں۔ "او جانے والے" بہت جلد آپ کے شہر کے کسی بڑے سنیما ہاؤس میں پیش کی جائے گی۔

اہنسا کی تکمیل!

کشمیر فلمس کا سرکلر نمبر ۲ مظہر ہے کہ ان کی پہلی تصویر "اہنسا" پایۂ تکمیل کو پہنچتی جا رہی ہے۔ "اہنسا" کا پس منظر ۱۹۴۲ء کے واقعات ہیں اداکاروں میں گیانی۔ تیواری۔ سنتوش۔ نوین یاگنک۔ انوری بائی۔ نند کشور۔ دلاری۔ ابوبکر اور خلیل آفتاب وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بیگم پارہ کی گرفتاری

ہمالیہ والا سے ایک ہوٹل میں کسی سرگرم بحث سے غصہ آجانے پر بیگم پارہ اور پروتیما داس گپتا نے اس پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں کہا جاتا ہے کہ پولیس نے ان دونوں ایکٹریسوں کو گرفتار کر لیا۔

بمبئی ٹاکیز

معلوم ہوا ہے کہ بمبئی ٹاکیز نے اپنی فلمی سرگرمیوں کا پھر آغاز کر دیا ہے اور اس وقت دو تصویروں کی فلمبندی کا کام بہت جلد شروع ہو رہا ہے۔ اس میں سے مسلم سوشل تصویر کے ہدایت کار رحیم ہیں اور دوسری تصویر مسٹر مغنی کی کہانی پر بن رہی ہے جس کے لئے نئے چہرے حاصل کئے جا رہے ہیں۔

رباب پروڈکشن

رباب پروڈکشن اپنی اولین تصویر "شہناز" کو ایک نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کاسٹ میں بیگم پارہ بھی شامل ہے۔

"شرم" کی تیاری

لاہور میں انڈو امریکن فلم کارپوریشن کے نام سے ایک نیا فلمی ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس نے اپنی پہلی فلم "شرم" کا اعلان کر دیا ہے۔ کہانی احمد شجاع کی ہے۔ موسیقی کے ذمہ دار غلام حیدر ہیں۔

پرواز کی مہورت

چودھری پروڈکشن کی پہلی تصویر "نئی بات" مکمل ہو چکی ہے اور اب وہ نمائش کے لئے تیار ہے۔ کمپنی اپنی دوسری تصویر "پرواز" کی مہورت بہت جلد کرنے والی ہے۔ جس میں ریحانہ۔ کملیش۔ امر اور صادق کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مزدور کا دور آیا مجبور کا دور آیا
صد شکر کہ بالآخر جمہور کا دور آیا

تازہ خبروں
سیاسی مضامین اور انقلابی و قومی نظموں کے لئے

روزانہ جمہور دہلی

کا مطالعہ فرمائیے۔ جمہور روزانہ پابندیٔ وقت سے ۳ بجے شام کو شائع ہوتا ہے۔ ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں جمہور کی ایجنسیاں قائم ہیں اس لئے جمہور کا حلقۂ اشاعت بہت وسیع ہے۔ جمہور میں اشتہار دیکر مشتہرین اپنے کاروبار کو ترقی دے سکتے ہیں
چندہ سالانہ ۲۴/۰/۰ روپئے۔ ششماہی ۱۳/۰/۰ روپئے
سہ ماہی ۷/۰/۰ روپئے۔ قیمت فی پرچہ ۱ر

مینیجر روزنامہ جمہور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ دہلی

ماہنامہ

مضراب کانپور

" ادب اور فلم کا سنگم ہوگا "
" ہماری زندگی کا عکاس ہوگا "
" معیاری ادب پیش کرے گا "

ایسا رسالہ — جو زندگی کے نئے معنے تخلیق کرے گا
جو صنعت فلمسازی کو بال و پر بخشے گا

ماہنامہ "مضراب" ہر ماہ عیسوی کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کریگا
پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۹۴۷ء کو شائع ہوگا۔

نگراں حضرت ثاقب کانپوری۔

مستقل لکھنے والے: حسرت موہانی، اثر لکھنوی، احتشام حسین، فراق گورکھپوری، منٹو، حسینی شاہد، صہبا لکھنوی، قمر ہاشمی، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر عبد العلیم، سالک الہاشمی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر رشید جہاں، جذبی، مجاز وغیرہ اور دوسرے ترقی پسند حسن کار۔

خط و کتابت کے لئے: مینجر ماہنامہ "مضراب" کلوٹ اسٹریٹ۔ کانپور

عوامی رجحانات کا ترجمان

جنتا ہفتہ وار

زیر ادارت حسینی شاہد
عنقریب شائع ہوگا

جس کو حیدرآباد اور حیدرآباد کے باہر کے ادیبوں اور حسن کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ اور جس میں نئے ادب کے تخلیقی نمونے، معاشیات، سیاسیات پر مقالے۔ حالات حاضرہ پر عوامی نقطۂ نظر سے، مزدوروں کی خبریں۔ کسانوں اور محنت کش عوام کی جدوجہد کی اطلاعات اور طلباء کے مسائل پر مضامین شائع ہوا کریں گے۔

مینیجر ہفتہ وار جنتا۔
۹۸۶۔ عثمان پورہ۔ حیدرآباد

ماہنامہ

"بصیرت" مالیگاؤں

یہ ادبی صحیفہ
عنقریب شائع ہوگا

ادب۔ علم۔ تاریخ۔ فلسفہ — "بصیرت" کے خاص موضوعات ہونگے۔ ملک کے سنجیدہ ادباء کی اظہار خیال کا مستقل ذریعہ ہوگا۔ ہنگامی ادب سے پاک ہوگا البتہ ایسے نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کیجائیگی جن کا کلام عارضی شور و شر سے متأثر نہیں۔ چندہ سالانہ پانچ روپئے فی کاپی ۸ر
نوٹ: مخرب اخلاق اشتہارات شائع نہ ہونگے۔
خریدار حضرات اور ایجنٹ صاحبان ذیل کے پتہ پر لکھیں۔

مینجر ماہنامہ "بصیرت"
اقبال روڈ۔ مالیگاؤں